فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	امت کا مقصدِ وجود	عظمیٰ پروین	8
قولِ نبیؐ	تزکیہ کرنے والے نبیؐ	ڈاکٹر آسیہ شبیر	11
خاص مضمون	مسلم خواتین کی ترقی کے امکانات	ڈاکٹر زکریا بشیر/ عائشہ عثمان	14
نوائے شوق	حمد باری تعالیٰ	شہود ہاشمی	25
	نعت	غازی بھوپالی	25
	اے رحمت عالمؐ	نجمہ یاسمین یوسف	26
	ہمارا کیا ہے	کرامت بخاری	27
	غزل	شاہدہ سحر	27
	غزل	شمیم فاطمہ	28
	غزل	روبینہ فرید	28
حقیقت وافسانہ	تارِ عنکبوت	افشاں نوید	29
	بیج	ام ایمان	32
	زہے نصیب	ربیعہ ندرت	36
انتخاب	ماتمِ یک شہرِ آرزو	رئیس فاطمہ	39
سلسلہ وار کہانی	شکست کے رتھ پر سوار	نصرت یوسف	46
مطالعہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	51
نمایاں خواتین کا تذکرہ	بی بی قرسم خاتون	آسیہ راشد	55
سیروسیاحت	ذرا دیوسائی تک	ثناء علیم	58
ہلکا پھلکا	ان کی صورت نظر آئے......	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	66
	غم سے نجات	شمیم فاطمہ	68
خفتگانِ خاک	آسماں تیری لحد پر......	امیمہ امجد	70
زندگی کا فن	ڈپریشن پر قابو پائیے	فریدہ خالد	72
بتول میگزین	رافعہ صلاح الدین، نبیلہ شہزاد		76
محشرِ خیال	فریدہ خالد، خورشید بیگم، عیشہ راضیہ		77
گوشۂ تسنیم	خوشحالی یا بدحالی	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ...... درجہ حرارت کے سکیل پر ہر روز پارہ کچھ اور اوپر چڑھ جاتا ہے۔ موسم کی یہ شدت اور رنگارنگی ہمارے وطن کو عطا کی گئی اللہ کی خاص عنایت ہے۔ یہ اور بات کہ اس عنایت کو آزمائش بنانے کا سہرا ہمارے اپنے سر ہے۔ ایک سال میں لوڈ شیڈنگ ختم تو کیا، کم بھی نہ ہو سکی۔ عوام احتجاج کے لئے سڑکوں پر ہیں اور حکمران حال مست۔ صنعتیں دھڑا دھڑ بند ہو رہی ہیں اور اشیائے خوردونوش کی قیمتیں پہنچ سے باہر۔ بنت مجتبیٰ مینا کے یہ اشعار کتنے حسبِ حال ہیں۔

روشن چراغ ہیں نہ ستاروں میں نور ہے
یعنی شریکِ غم شبِ ہجراں ہے ان دنوں
اے عندلیب زار! تری آرزو کی خیر
صیاد باغبان و نگہباں ہے ان دنوں
پوشیدہ کب ہے اہلِ وطن سے وطن کا حال
ہر لمحۂ حیات پریشاں ہے ان دنوں

میڈیا کے کردار پر خود میڈیا کے اندر سے انگلیاں اٹھیں جب حامد میر نے ریاستی اداروں کو کھل کر نشانہ بنایا۔ معاملہ اگرچہ عدالت میں ہے مگر تبصرے زور و شور سے جاری ہیں اور ایک چینل کو بند کرنے کا مطالبہ زوروں پر ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ وہی چینل ہے جس نے چند ماہ قبل فوجی آپریشن کے بارے میں سید منور حسن کے ایک بیان کو اس طرح پیش کیا اور بدنامی کی مہم چلائی کہ سنجیدہ حلقوں میں انتشار سا پیدا ہو گیا۔ اب وہی چینل ''صحافتی تنہائی'' کا شکار ہے کیونکہ اس نازک وقت میں اپنے دفاعی اداروں پر براہِ راست الزام تراشی کسی طرح بھی ملکی مفاد میں نہ تھی۔

عدالتی فیصلہ جو بھی ہو، لیکن بہتر ہے کہ اس واقعے کی بنیاد پر ہمارے میڈیا کو حدود و قیود کا پابند بنانے کے لئے کچھ اصول مقرر کیے جائیں اور جس طرح دنیا بھر میں ہوتا ہے، قوم اور ریاست کے مفادات کو آزادیِ اظہار پر مقدم رکھنے کو یقینی بنایا جائے۔ ذرائع ابلاغ کو حکومت کے نگران (watch dogs) کہا جاتا ہے۔ مگر ہمارا میڈیا جس طرح آزادیِ اظہار کے نام پر سنسنی خیزی، من مانی اور کمرشل ازم رواج دے رہا ہے، اب یہ سوال اکثر اٹھنے لگا ہے کہ میڈیا کے لئے بھی Watch dogs ہونے چاہئیں۔ ضروری ہے کہ میڈیا کا ایسا ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے جس کے نتیجے میں میڈیا کے اندر خود احتسابی کی روایت جنم لے اور اس بے پناہ طاقت کا استعمال ذمہ داری کے ساتھ کیا جائے۔

جماعت اسلامی میں حسبِ روایت نئے امیر کا انتخاب عمل میں آیا۔ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں میں یہ واحد جماعت ہے جس میں روزِ اول سے دستوری طریقِ کار کے مطابق ہر پانچ برس بعد امیر کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر رکن فیصلہ کرنے میں آزاد ہوتا ہے اور کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر اپنا ووٹ استعمال کرتا ہے۔ اس انتخاب کے لئے کوئی خود سے امیدوار نہیں بن سکتا۔ بلکہ ایسی خواہش رکھنے والا بھی نا اہل قرار پاتا ہے۔ جماعت کے نظام سے معمولی سی واقفیت بھی بتا دیتی ہے کہ یہاں اثر و رسوخ یا موروثیت کا کوئی گزر نہیں۔ اس میں ہر سطح پر قیادت کے

منصب کو عہدے کی بجائے امانت اور ذمہ داری سمجھنے کا کلچر پایا جاتا ہے۔ اسی لیے بارِ امانت سے سبکدوش ہونے والا خوش باش اور عہدہ پانے والا منوں بوجھ تلے دبا دکھائی دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک میں جمہوری نظام کو کامیاب بنانے کے لئے از حد ضروری ہے کہ سیاسی جماعتوں کے اندر انتخابات کو آئینی طور پر لازم کیا جائے۔ اس وقت پاکستان چند بڑی سیاسی جماعتوں کی موروثی سیاست کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا ہے۔

باپ، بھائی، بیٹا، چچا، بھتیجا، پوتا آپس کی ملی بھگت سے برسوں حکومت کرتے رہتے ہیں اور عوام کی حالتِ زار نہیں بدلتی۔

تقریبِ حلف برداری میں نئے امیر جناب سراج الحق اور سابق امیر سید منور حسن صاحب کی تقاریر سن کر احساس ہوا کہ پاکستان میں حقیقی تبدیلی ایسے ہی خاک نشینوں کے ہاتھوں آسکتی ہے۔ نئے امیر کی جامع تقریر میں صرف جماعت کا نہیں بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وژن جھلکتا تھا۔ پاکستان کو جدید اسلامی فلاحی ریاست بنانے کا خواب، ہمسایہ ممالک سے بہترین تعلقات کی خواہش، ظلم، کرپشن اور استحصالی قوتوں کے خلاف معاشرے کے تمام طبقات کے ساتھ مل کر مشترک جدوجہد کا عزم، ترقی کے عمل میں خواتین کی بھرپور شرکت پر یقین، امت کی یک جہتی اور کشمیریوں کی اخلاقی حمایت پر ڈٹے رہنے کا اعلان، قبائلی جنگجوؤں سے مذاکراتی عمل کا تسلسل اور بلوچستان اور کراچی میں امن کے لئے ٹھوس اقدامات جیسے اہم ترین نکات سے مزین یہ خطاب قیادت کی بصیرت کا آئینہ دار تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ بصیرت اور کردار و عمل کی مضبوطی کا یہ امتزاج اہلِ پاکستان کے دلوں پر دستک دینے میں کب کامیاب ہو سکے گا۔

سندھ ہائی وے پر خوفناک بس حادثہ بہت سی قیمتی جانیں لے گیا۔ اللہ مرنے والوں کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے آمین۔

لاپتہ افراد کی خاتون لواحقین پر پولیس تشدد اور ان سے توہین آمیز سلوک کا واقعہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ جن سیاسی رہنماؤں نے طول طویل وعدے اور جذباتی تقریریں کر کے اپنے جلسوں کو گرمایا تھا، آج وہی اقتدار کا تقریباً ایک برس گزر جانے کے باوجود چپ سادھے بیٹھے ہیں۔

مینا صاحبہ ہی کے ان خوبصورت اشعار کے ساتھ اجازت

آیئے دیکھیے رنگِ طوفاں ذرا — صرف دھاروں کی باتوں سے کیا فائدہ
دل اگر مثلِ لالہ نہیں داغ داغ — لالہ زاروں کی باتوں سے کیا فائدہ
رسمِ مینا و ساغر اٹھا دیجیے — چاند تاروں کی باتوں سے کیا فائدہ

دعا گو

صائمہ اسما

امت کا مقصدِ وجود

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِوَ تُؤ مِنُوْنَ بِاللّٰہِO

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو (11:3)

فضیلت واہمیت:

قرآن پاک میں امت مسلمہ کو خیر امت، امت وسط اور مرکزی گروہ کے خطابات سے نوازا گیا۔ وہ خیر امت اللہ تعالیٰ سے کسی خصوصی تعلق محبوبیت کی وجہ سے نہیں بنی۔ اللہ کے ہاں اعزاز وشرف ان خام خیالوں کی بنا پر نہیں ملتا جس میں اہل کتاب مبتلا ہو گئے تھے" ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔" دراصل انسانیت کو برائی سے بچانا اور معروف پر قائم کرنا مطلوب تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس بہترین امت کے فرائض ہیں جن کو لے کر اسے اٹھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کا وہی مشن قرار دیا جو اپنے اپنے دور میں انبیا کا مشن رہا ہے۔

دعوتِ دین کے کام کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اللہ کی مدد کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے۔ جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں ان کو اللہ اپنا رفیق ومددگار قرار دیتا ہے۔ یہ وہ بلند ترین مقام ہے جس تک کسی بندے کی رسائی ممکن ہے۔ تمام قسم کی عبادات میں تو انسان محض بندہ غلام ہوتا ہے مگر اقامت دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت اور مددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: اللہ تعالیٰ کی راہ میں تمہارا کھڑا رہنا گھر کے اندر پڑھی جانے والی تمہاری ستر برس کی نمازوں سے بھی افضل ہے۔

(ترمذی)

مقصدِ وجود:

امتِ مسلمہ کو لوگوں کی اصلاح کے لئے برپا

کیا گیا ہے۔ امت کی زندگی میں دعوت دین کے کام کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں دل کی حیثیت ہے۔ خدا نے امتِ مسلمہ کو اسی لیے برپا کیا تھا کہ وہ دوسروں تک خدا کا دین پہنچائے۔ نیکیوں کا پرچار کرے، فکر دے۔ نظامِ حیات دے، صحیح اخلاق دے، صحیح علم ومعرفت عطا کرے اور نوع انسانی کی زندگی کو ہر طرح کے شر اور فساد سے پاک کردے۔ پس مسلمانوں کا اولین اور اہم ترین کام ہر خاص وعام کو خدا پرستی اور پابندی دین کی دعوت دینا ہے۔ یہ کام اتنا بنیادی اور اتنا اہم ہے کہ یہ ہر قسم کے حالات میں جاری رہتا ہے۔ مسلمان خواہ اقتدار کے تخت پر ہو۔ یا میدانِ جنگ میں، خوشحال طبقوں تک رسائی ہو یا غریبوں سے میل جول ہو، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا کم درجے کا، دعوتِ دین کا کام ہر حال میں اسکی ذمہ داری ہے۔ یہ عمر بھر کی ڈیوٹی ہے۔ یہی وہ ذمہ داری ہے جو زندگی کے دوسرے تمام کاموں سے بڑھ کر سلیقے اور فکر مندی سے ادائیگی کا حق رکھتی ہے۔

ہر مسلمان کو اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ ہر محفل، ہر طبقہ اور ہر مقام پر کسی خوف وخطر کے بغیر یقین کی پوری قوت اور جرأت کے ساتھ اپنی بات پیش کرسکیں اور اپنے مقام کی قدر وعظمت پر یقین رکھتے ہوئے پیش کرسکیں۔ رب سے وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان رب کی نافرمانی کو برداشت نہ کرے۔ نہایت دلسوزی، شیریں گفتاری اور حکمت سے بھلائیوں کی ترغیب دے اور منکرات سے روکے۔

خدا کی فوج اور حزب اللہ کے سپاہی کو چاہیے کہ اسلام کا نمائندہ بن کر اس طرح زندگی گزارے کہ اس کے قول وعمل سے لوگ اسلام کو سمجھیں اور سیکھیں۔ اسے چاہیے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اس آبِ حیات کو پہنچانے کے لئے اپنی ساری متاعِ حیات وقف کردے۔ اپنی تمام صلاحیتوں اور وسائل کو اس راہ میں کھپادے۔ اپنی زندگی کی دوسری تمام دلچسپیوں اور چھوٹے چھوٹے مقاصد کی قربانی برداشت کرلے۔ اپنے اس فریضے کی ادائیگی کے بغیر وہ ہر وقت مضطرب رہے۔ اسی کے لئے تدابیر سوچا کرے اور دعوت کے نئے راستے تلاش کرتا رہے۔

جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لئے رسولؐ اللہ کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے۔ اسی طرح دنیا کے عام انسانوں تک اس

ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری ہم پر عائد کی گئی ہے۔تبلیغی سرگرمیوں سے ہماری غفلت کے سبب خیال وعمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین پر برپا ہوئے ہیں ان سب کے لئے آئمہ شر اور شیاطین انس وجن کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت اور ظلم وگمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے!

أُخرِجت للنَّاس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امت ساری انسانیت کے لئے برپا کی گئی ہے۔اسلام ایک عالمی اور انسانی دین ہے وہ صرف مسلمان قوم کی قومی اور ملی میراث نہیں۔اسلام خدا کی ایک نعمت ہے اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام بندے اس سے فیضیاب ہوں۔امتِ مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا دعوتِ دین کی ذمہ داری کا ایک جُز ہے۔امت کا اصل مشن یہ ہے کہ ان لوگوں میں قول وعمل سے اسلام کی دعوت پہنچائیں جو اس سے ناواقف ہیں اور اس کو اپنا دین نہیں مانتے،ہمیں تو افریقہ کے جنگلات میں،امریکہ، بھارت، چین غرض پوری نوعِ انسانی تک محمد رسولؐ اللہ کے پیغام کو پہنچانا چاہیے۔خدایا! کس کس کا حق ہم پر رکھ دیا اور ہم کس قدر غافل ہیں۔

زوالِ امت کا سبب:

دراصل ہر چیز اسی وقت تک وقعت کے ساتھ باقی رہتی ہے جب تک وہ اپنے مقصد وجود کو پورا کرتی رہتی ہے۔ جب امت نے اس مقصد ہی کو فراموش کردیا جس کے لئے اسے برپا کیا گیا تھا تو پھر خدا کو اس کی کیا پروا کہ کون اسے پیروں سے روندرہا ہے اور کون اس کی عزت سے کھیل رہا ہے۔جب امت کی صفت وخاصیت ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے تو اس فریضے کو ترک کرنے پر اس کا وجود ہی معدوم تصور ہوگا۔

آج مسلمانوں کی حالتِ زار یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو یہ تک معلوم نہیں کہ ان پر کس قدر عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔آج مسلمان احکامِ الٰہی سے غافل اور عملاً فسق وفجور اور ظلم ونافرمانی کے مرتکب ہیں افرادِ امت دوسری اقوام وملل کو دین کی دعوت دینے کی بجائے اپنے طرزِ عمل سے دنیا کو اسلام سے اور زیادہ دور کررہے ہیں۔ اسلامی معاشروں کے اندر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے بہت ہی کم

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منکر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور معروف دبتا ہی چلا جا رہا ہے۔

اللہ کے دین کے لئے حمیت دراصل ایمان کی بڑی نشانی ہے۔ پہلے پہل اسلامی حمیت دب جاتی ہے جس طرح چنگاری کو راکھ میں دبا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ ٹھنڈی ہو کر بجھ جاتی ہے۔ دراصل کسی برائی کا ارتکاب دیکھتے دیکھتے انسان کے دل سے اس برائی کی کراہیت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر لوگ اسے مٹانے کے لئے فوراً اٹھتے بھی نہیں۔ قرآن گواہ ہے (63:5) کہ جب کوئی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ اور فساد کا شکار ہوتا ہے تو اس کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ ان کے علماء غلط افکار کے پھیلاؤ اور قانون شکنی کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے اور کتاب اللہ کی حفاظت کا جو فریضہ ان پر عائد کیا گیا ہے اسے پورا نہیں کرتے۔

اپنے اولین فریضے سے غفلت برت کر آج امت مسلمہ دنیا میں نہایت بھیانک انجام سے دوچار ہے اور آخرت میں سخت تر سزا کا اندیشہ ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے: اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تمہیں معروف کا حکم دینا ہوگا اور تمہیں منکر سے روکنا ہوگا ورنہ قریب ہے کہ اللہ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر صورتحال یہ ہو جائے کہ تم اسے پکارو گے اور وہ تمہاری پکار کا کوئی جواب نہیں دے گا (ترمذی) امام احمد بن حنبل نے ایک روایت نقل کی ہے: حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ایک آدمی اپنے پڑوسی کا دامن پکڑ کر یہ فریاد کرے گا، اے میرے رب! اس نے میرے ساتھ خیانت کی ہے وہ جواب دے گا پروردگار تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس کے اہل وعیال اور مال میں کوئی خیانت نہیں کی ہے فریادی کہے گا پروردگار یہ بات تو سچ کہتا ہے لیکن اس نے خیانت یہ کی ہے کہ اس نے مجھے گناہ کرتے دیکھا لیکن کبھی مجھے گناہ سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

دورِ حاضر میں راہِ عمل:

ہمارے معاشرے میں اللہ تعالٰی کے حقِ حاکمیت کو عملاً مسترد کر دیا گیا ہے اور اللہ کی شریعت متروک ہے۔ یہاں دراصل اسی منکرِ اکبر سے تمام منکرات پید اہوتے ہیں۔ اس منکرِ اکبر سے نجات کیلئے حقیقی جدوجہد اور بھاری قربانیوں کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر ایسے صالح افراد کی ضرورت ہے جو اس وادیٔ پرخار میں محض اللہ کے بھروسے پر کود جائیں۔ صرف اسی کی رضا کو مطلوب بنا کر حکمت

ودانائی اورٹیم ورک کے ساتھ اجتماعی سعی وجہد کو آگے بڑھائیں۔ ایسے صالح افراد کو تلاش کرنے کا راستہ بھی صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ہے۔ اس کام میں جوش سے زیادہ ہوش کی اور ہروقت کی واعظانہ گفتگو سے بڑھ کر شخصی روابط بڑھانے کی اور دوسروں کے دلوں کو فتح کرنے کی ضرورت ہے۔

کل عالم اسلام کے اکثر اوطان میں فسق وفجور اوراللہ کی معصیت کو لوگوں کے شخصی معاملات سمجھا جاتا ہے۔کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دے سکتا بلکہ اسلامی معاشروں میں ظلم، مار دھاڑ، سرکشی اور زیادتی اس قدر طاقتور ہیں کہ ڈر کے مارے لوگوں کے منہ بالکل بند ہیں، زبانوں پر تالے لگے ہوئے ہیں اور جو شخص بھی برائی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔

فریضۂ دعوتِ دین کی ادائیگی بڑے اونچے حوصلے اوراولوالعزمی کا کام ہے۔ دراصل دعوت کا مزاج ایسا ہے کہ یہ لوگوں کی خواہشات،میلانات اور مفادات کے ساتھ متصادم ہوتا ہے۔ عموماً نفس پرست لوگ دعوتِ حق کو اپنے لیے مصیبت سمجھ کر داعیانِ حق کے دشمن بن جاتے ہیں اورانہیں ہر طرح کی ایذا دہی کا نشانہ بناتے ہیں لیکن ایک صالح معاشرے کے قیام اور بچاؤ کا یہی راستہ ہے ایک سچے داعی کو یہ تمام مراحل صبر سے طے کرنے ہوتے ہیں کیونکہ اسی میں رب تعالیٰ کی رضا ہے۔

ان سنگین اورمشکل ترین حالات میں جوگروہ بھی اٹھ کر مخلوقِ خدا کو برائیوں سے پاک کرنے اور بھلائیوں کو قائم کرنے کے لئے آواز اٹھائے گا اور اس راہ میں پہنچنے والی اذیتوں کوصبر سے برداشت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنی مخلوق کے درمیان نہایت اونچا اور بلند مقام عطا فرمائے گا اور دربارِ خداوندی میں اس کو قرب کا وہ مقامِ امتیاز حاصل ہوگا کہ قربت کا درجہ بھی اس کی بلندی کو نہ پاسکے گا۔

دین کا تحفظ واحیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی پر منحصر ہےاورامت کی زندگی بھی اسی فریضے کی انجام دہی میں ہے۔ نبوت تو ختم ہوگئی مگر کارِنبوت باقی رہے گا۔

(تحریکی شعور، شعورِ حیات، دین کی خدمت، رسول اکرمؐ کی حکمتِ انقلاب فی ظلالِ القرآن، تفہیم القرآن)

☆☆☆

ڈاکٹر آسیہ شبیر

تزکیہ کرنے والے نبی ﷺ

نبی اکرم ﷺ ختم المرسلین تھے۔ آپؐ کے واسطے سے انسانوں کو آسمانی رہنمائی کے جو تکمیلی اسباق ملے، ان میں تعلیم نبوت کا مقصودِ حقیقی تزکیہ ہی کو قرار دیا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ، کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے بعثت ختم المرسلین ﷺ کے لئے جو دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان میں انہیں میں سے ایک رسول اٹھانا جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ (البقرہ۔۱۲۹) صرف یہی دعا ہے جہاں تزکیہ کو آخر میں ذکر کیا گیا۔ قرآن مجید کی دیگر تین آیات میں جہاں نبی کریم ﷺ کے مقاصد بعثت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں تعلیم کتاب وحکمت کا ذکر بعد میں آیا ہے اور تلاوت آیات اور تزکیہ کے حصول کا ذکر پہلے۔ (البقرہ۔۱۵۱، آل عمران،۱۶۴) اس تقدیم سے واضح ہے کہ تزکیہ وتربیت، کتاب وحکمت کی تعلیم کو اور دیگر علوم نافع کو قلب وذہن میں جاگزیں کرنے اور ان کے مکمل فوائد وثمرات کے حصول کیلئے ناگزیر ہے۔

نفوس انسانی کو غلط میلانات ورجحانات سے موڑ کر نیکی کے راستے پر ڈالنا اور درجہ کمال تک پہنچنے کے لائق بنانا اگر تزکیہ کا مفہوم ہے تو نبی کریمؐ کی دعوت کا اولین تعارف یہی تھا۔

بخاری نے حضرت ابوذر غفاریؓ تک دعوت اسلام پہنچنے کے تذکرے میں لکھا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو جب نبی کریمؐ کی بعثت کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے بھائی کو پتہ کرنے کیلئے بھیجا ''میرے پاس اس شخص کی خبر لے کر آؤ جو زعم رکھتا ہے کہ وہ نبیؐ ہے اور اس کے پاس آسمان سے خبریں آتی ہیں۔ اس کی بات اچھی طرح سننا پھر مجھے آکر بتانا۔'' ان کے بھائی نے آکر صرف دو جملوں میں نبیؐ کے احوال ذکر کیے'' **را یتہ یامر بمکارم الاخلاق۔ وکلاماًماھو الشعر** (میں نے انہیں پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے پایا اور وہ کلام شاعری نہیں ہے)''

ابوسفیان قبل از اسلام قیصر کے دربار میں نبی کریمؐ

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے طلب کیے گئے تھے۔ روم کے بادشاہ قیصر نے ان سے نبی کریمؐ کے نسب، ان کے پیروکاروں کی دین پر استقامت اور خود نبیؐ کے ذاتی معاملات کے بارے میں سوال کرنے کے بعد پوچھا کہ وہ تمہیں کیا کرنے کو کہتے ہیں (ماذا یامرکم؟) ابوسفیان کا جواب بھی عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفوس کے لائحہ عمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یقول۔ اعبدوالله وحده ولاتشرکوا به شیئا واترکوا مایقول آباءکم ویأمرنا بالصلاة والصدق والعفاف والصلة) یعنی وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تمہارے باپ داد جو کہتے ہیں اسے چھوڑ دو اور ہمیں نماز، سچائی، پاکیزگی اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔

تعلیم کے ساتھ تزکیے کا عمل اصحاب نبی ﷺ کی زندگیوں میں ظاہر ہوا تو اہل ایمان شکر کے جذبات کے ساتھ اس کا تقابل اپنی سابقہ زندگی سے کرتے تھے۔ حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر فرمائی، جسے ابن ہشام نے روایت کیا ہے، اس میں انہوں نے مسلمانوں میں رونما ہونے والی اخلاقی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے رہبانیت، تقشّف اور زہد وعبادت گزاری کا نہیں بلکہ ان صفات کا ذکر کیا جو رذائل نفس کو مٹا کر محمد ﷺ کے پیروکاروں میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس تقریر میں اسلامی اور جاہلی طرز زندگی کا فرق چند جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ''اے بادشاہ! ہم جاہل تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ مردار کھاتے اور بے حیائی کے کام کرتے تھے۔ قطع رحمی کرتے تھے اور ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے قوی، ضعیف کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جس کے نسب، امانت اور پاک دامنی سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے آباء جن بتوں اور پتھروں کی عبادت کرتے تھے، ان کو چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت کا پاس کرنے، ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے، حرام چیزوں اور خون ریزی سے بچنے کا حکم دیا۔ جھوٹ بولنے، یتیموں کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا اور حکم دیا کہ ایک خدا ہی کی

پرستش کرو۔''(ابن ہشام)

تزکیہ نفوس کی اس دولت ہی کی وجہ سے مسلمانوں میں بہادری، شجاعت اورانسانی ہمدردی کے وہ بے پایاں جذبات بیدار ہوئے جن کے بل پر انہوں نے دیگر انسانوں تک بھی اس دعوت کو پہنچانے کے لیے سارے خطرات مول لیے۔ شاہ ایران یزدگرد کے دربار میں حضرت مغیرہ بن زرارہؓ نے،مسلمانوں کی آمد کا مقصد بیان کیا تھا۔اخراج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ الواحد القھار۔یعنی لوگوں کوانسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ واحد وقہار کی بندگی کی طرف لانا۔اس کے ساتھ ساتھ حضرت جعفرؓ ہی کی طرح اخلاق وکردار کی ان پستیوں کو بیان کیا جن میں وہ اسلام سے پہلے مبتلا تھے اوراس تبدیلی کا ذکرکیا جو اسلام قبول کرنے کے بعدان میں رونما ہوئی۔(تاریخ طبری) حضرت مغیرہؓ کےاس واقعے سے استدلال کرتے ہوئے مشہور مستشرق،گستاولی بان نے گواہی دی''کچھ ہی کیوں نہ ہو،حضرت رسالت مآب ﷺ نے ملک عربستان میں وہ اخلاقی نتائج پیدا کرلیے جوکوئی مذہب قبل از اسلام (اپنے پیروکاروں میں)پیدا نہ کرسکا تھا۔''(تمدن عرب)

حضرت اکثم بن صیفیؓ کے نمائندوں کے سامنے، ان کے سوالات کے جواب میں آپ نے جودعوت رکھی وہ قرآن مجید کے پیش کردہ تزکیہ کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔آپ نے فرمایا میری دعوت یہ ہے

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی(النحل۔۹) بے شک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اوربدی،بے حیائی اور ظلم اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔(ابن کثیر)

تزکیہ:......علمی اورعملی زندگی کی روحِ رواں

مذہبی اورتعلیمی زندگی کی تاریخ میں نبی کریم معلم انسانیت ﷺ کا یہ کارنامہ سرفہرست رکھے جانے کے لائق ہے کہ آپ ﷺ نے ایک تو تزکیہ کا وہ جامع مفہوم پہلی مرتبہ انسانوں کے سامنے پیش کیا جس کو ہمیشہ افراط وتفریط میں گم کیا جاتا رہا تھا۔دوسرے یہ آپؐ نے تزکیہ کے عمل کوزندگی کی روحِ رواں بنادیا۔

نبی کریمؐ جو''دین قیم'' لے کرآئے،اس میں تزکیہ نیت، عقیدے، عمل، عبادات، اخلاقیات اورمعاملاتِ زندگی کے ہرپہلو پر حاوی ہے۔ دین

اور دنیا کی ساری بھلائیاں بیک وقت مطلوب بھی ہیں اور محمود بھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے سعادتِ انسانی کے تعین کے حوالے سے بحث میں بڑے موثر دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ نظام کائنات ہو یا نظام انسانی، ان دونوں کی بقاء، استحکام اور استمرار کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کرنا اور اس سب مشغولیت کے باوجود زندگی کے روحانی تقاضوں کو فراموش نہ کرنا حتیٰ المقدور اس حوالے سے کوشش اور جدوجہد میں مصروف رہنا، انسان کی حقیقی سعادت ہے اور اس میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے (حجتہ اللہ البالغہ)

نبی کریمؐ نے زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے یہی تعلیم عطا فرمائی۔ مثلاً نکاح کو سنت قرار دیا اور یہاں تک فرمایا۔ فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ ''جو میری سنت سے منہ موڑے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' (بخاری) اپنی امت کے لئے یہ نہیں مقرر فرمایا کہ اچھا وہ ہے جو گھربار چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جائے، جسم کے ''ناپاک تقاضوں'' کو پورا کرنے کے بجائے ''نجات'' کے حقیقی مقصد کو سامنے رکھے اور رشتہ و پیوند کے کسی ''مایا جال'' میں گرفتار ہو۔ بلکہ فرمایا کہ ''خیرکم خیرکم لاھلیکم، وانا خیرکم لأ ھلی (ترمذی) یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور میں تم سب میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے والا ہوں۔ گھر اور خاندان کو تعلیم اور تربیت کا اولین مرکز بنایا جہاں ''عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں پر نگران ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا'' (بخاری) اور باپ کو یوں ذمہ دار بنایا کہ ''کوئی باپ اپنی اولاد کو حسن ادب سے بڑھ کر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا۔'' (مشکوٰۃ) والدین اور اولاد کے ساتھ ساتھ قرابت داروں، ہمسایوں، اہل حاجت، حتیٰ کہ چند گھڑیوں کی مصاحبت جس کے ساتھ ہو جائے، اس کے بھی حقوق مقرر فرمائے گئے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن کو کامیابی کا معیار قرار دیا گیا۔ (حجتہ اللہ البالغہ)

قرآن مجید میں عیسائیوں کے رہبانیت اختیار کرنے کی وجہ، یعنی خوشنودی رب کی تلاش کو قابل مذمت نہیں ٹھہرایا گیا، ''بدعت'' ان کے رہبانی احکام وقوانین ایجاد کرنے کو قرار دیا اور اس کی مذمت کی گئی (الحدید۔۲۷)۔ اپنے سے متصل قبل کی اس امت

کے ''افراط'' کے طور طریقوں سے سبق اخذ کرتے ہوئے، نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو غلو اور تشدد و تعمق کی طرف جانے سے سختی سے روکا۔ فرمایا ''اپنے اوپر سختی نہ کرو اللہ تم پر سختی کرے گا۔ ایک گروہ نے یہی تشدد اختیار کیا تھا تو اللہ نے بھی اسے سخت پکڑا۔ دیکھ لو وہ ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں موجود ہیں۔ (ابوداؤد) قرآن مجید ایک دن میں صرف اتنا پڑھنے کی اجازت دی کہ تفکر و تدبر ہو سکے اور طبیعت پر بوجھ نہ ہو (ابوداؤد) نماز اور نوافل اتنے ہوں کہ رسی باندھنے اور اس کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ (ابوداؤد) بعض صحابہؓ کے بہت اصرار کے باوجود بار بار نصیحت فرمائی کہ روزے اتنے نہ ہوں کہ نظام جسمانی معطل ہو جائے اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ ہونے لگے۔ (بخاری) ایک موقع پر تو یہاں تک فرمایا کہ اگر روزے کی وجہ سے کوئی شخص دوسروں کی خدمت کا محتاج ہو جائے تو وہ لوگ اس سے اجر و ثواب میں آگے بڑھ جائیں گے جو انسانی ہمدردی اور خدمت کا کام کریں گے (مسلم)

مالی معاملات میں بھی نبی کریمؐ نے توازن اور اعتدال کو برقرار رکھنے کی ہدایات عطا فرمائیں، اگرچہ صدقہ پر زور بھی دیا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان مومنین صادقین میں سے تھے جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ پچاس دن بعد جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے نبی کریمؐ کے سامنے اپنا کل مال صدقہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ سب نہیں، کچھ رکھ کر باقی صدقہ کرو۔ (بخاری) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنی بیماری میں سب مال صدقہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بھی صرف ایک تہائی کی اجازت دی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ تہائی حصہ بھی بہت ہے۔ (ترمذی) کسب معاش کو ''اللہ کے فضل کی تلاش'' قرار دیا گیا۔ (الجمعہ۔۱۰) مال کو ''خیر کہا اور حلال رزق کے لیے کوشش کرنے والے کا درجہ مجاہد فی سبیل اللہ کے برابر بیان فرمایا۔ (المزمل۔۳۰) ''تزکیہ'' کی مخصوص اور روایتی دنیا میں یہ خیالات اور اعمال بالکل نئے تھے!

نبی محترم ﷺ نے جہاد و قتال کو دین کی بلند ترین چوٹی قرار دیا ''ذروۃ سنامہ الجھاد'' (ترمذی) اپنی بے تابانہ خواہش کا اظہار فرمایا کہ مجھے پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا

جاؤں۔(مسلم)حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں، آپؐ نے اپنی امت کو وہ ''آتشیں شریعت'' (بائبل،کتاب استثناء) عطا فرمائی (ایسی شریعت جس میں جہاد وقتال کے احکام بھی شامل ہوں) جس میں رہبانیت، زندگی سے فرار، نیکی اور نیکی کے داعیوں کا معاشرے سے کنارہ کش ہونا اور فساق وفجار کے ہاتھوں میں مملکت اور سلطنت کی زمام کار چھوڑ دینا، ہمیشہ کیلئے مسدود کردیا گیا۔آپؐ یہ فرما گئے کہ **الجهاد ماض الی یوم القیامة** جہاد قیامت کے دن تک جاری رہے گا۔(ابوداؤد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی زندگی کا سامان بھی اور سامان رزق بھی جہاد ہی میں رکھا گیا۔ **وجعل رزقی تحت ظل رمحی** میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں رکھا گیا ہے۔(بخاری) جہاد ومزاحمت کا یہ جذبہ باقی نہ رہے تو امتیں ترنوالہ بن جاتی ہیں۔

معاملاتِ زندگی کا کون سا پہلو ہے جو پاکیزگی کی تربیت سے محروم رہ گیا ہے۔درحقیقت یہ وہ تکمیلی تعلیم تھی جو نبی آخرالزماں کے حوالے سے انسانیت کو عطا کرکے،آسمانی رہنمائی کا باب بند کردیا گیا۔

☆☆☆ (جاری ہے)

ڈاکٹر پروفیسر زکریا بشیر امام
ترجمہ: عائشہ عثمان

مسلم خواتین کی دورِ جدید میں خودمختاری و ترقی کے امکانات

اس عنوان کے تحت یہ مقالہ اسلام آباد میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر زکریا بشیر سوڈان حکومت کے مشیر، عربی اور انگریزی میں کئی کتب کے مصنف اور ریسرچ سکالر ہیں۔ اسلامک فلاسفی میں یونیورسٹی آف پٹس برگ (امریکہ) سے پی ایچ ڈی کی اور لٹریچر کے ملکی اور بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کیے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان کا یہ مقالہ انگریزی سے ترجمہ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیرہ)

اس موضوع پر آئے دن متعدد مسائل اور مباحث منظرعام پر ابھرتے ہیں، جس کی وجہ سے مختلف النوع مؤقف اور نظریات جنم لیتے ہیں۔ اگرچہ ان مسائل کے حل پر روشنی ڈالنے کے لئے سینکڑوں کتابیں شائع کی جا چکی ہیں، اس کے باوجود بھی تاحال کوئی تسلی بخش حل ایسا نہیں پیش ہوسکا جس پر اجماعِ امت ہوسکا ہو۔

جدید دور کے مسلم معاشروں میں مسلمان عورت کے کردار کا تعین ایک ایسا ہی متنازعہ اور پیچیدہ مسئلہ بن چکا ہے۔ جو مسائل وسوالات اس راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہیں، ان میں سے چند ایک کی نشاندہی مندرجہ ذیل نکات میں کی گئی ہے۔

1۔ کیا عمومی معاشرے میں مسلمان عورتوں کا کوئی ''عملی کردار'' ان روایتی گھریلو ذمہ داریوں سے ہٹ کر بھی ممکن ہوسکتا ہے جن کو وہ صدیوں سے نبھاتی چلی آرہی ہیں؟

2۔ اگر بالفرض یہ طے ہو بھی جائے کہ مسلمان عورت کا گھر کی چار دیواری سے باہر کوئی عملی کردار ہوسکتا ہے، تو پھر اس کردار کی نوعیت کیا ہوگی؟ کیا یہ ایک باقاعدہ کیریئر پر مبنی کردار ہوسکتا ہے؟ مثال کے طور پر ایک پروفیشنل ڈاکٹر، انجینئر، بینکر، پولیس، فوجی، مینیجر، وکیل وغیرہ یا پھر مسلمان عورت کو محض روایتی یا محدود دائرہ کار ہی میں کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، جو کام اس کے صنفی مزاج سے میل رکھتے ہوں؟ اور سب سے اہم ترین بات یہ کہ ان اضافی کاموں کی وجہ سے بحیثیت ماں یا بیوی اس کی اصل گھریلو ذمہ داریاں منفی طور پر متاثر نہیں ہونی چاہئیں چونکہ دراصل یہ گھریلو کردار صرف اسی عورت کی زندگی کا ہی نہیں بلکہ اسکے ساتھ وابستہ پورے خاندان کی زندگی کا محور ہے

اور یہی حقیقت میں ایک خوشگوار، پرسکون زندگی کا تقاضا ہے۔

3۔ پھر اگر مسلمان عورت کو گھر سے باہر عمومی معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی غیر مشروط وبلا روک ٹوک اجازت دے بھی دی جائے، تو اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ گھر سے باہر اسکو غیر اخلاقی رویے یا تشدد کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا؟

4۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ بحیثیت Professional عورت کو مرد کے برابر ہی تنخواہ دی جائے جبکہ وہ اس کے کسی مساوی عہدے پر فائز ہو؟

5۔ ایسے کون سے مناسب قوانین ہوں گے جو اس بات کو یقینی بنا سکیں کہ عورت کو کام کرنے کی جگہ (work place) میں اس کے تمام جائز حقوق دیئے جائیں گے، حتیٰ کہ ان کے اوپر بطور بیوی یا ماں گھر کے اندر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا خیال رکھا جائے اور اس کے مطابق ضروری گنجائشیں (Relaxations) بھی دی جائیں؟

اس سے بھی اہم تر سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی عورت کے لئے سارا دن گھر سے باہر کا کام کرنے کے بعد، گھر واپس لوٹ کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ذہنی وجسمانی طور پر ممکن بھی ہوسکتا ہے، یا نہیں؟ (مثلاً کھانا پکانا، صفائی ستھرائی، گھر، شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ)

6۔ گھر سے باہر کام کرتے ہوئے عورتوں کی آمدورفت اور اوقات کار کا ان کی ضرورت کے مطابق خاص خیال کس طرح اور کون رکھے گا؟ اگر کوئی عورت حاملہ ہو جائے یا اس کا شیر خوار بچہ ہو تب اس کو کس طرح سے سہولت دی جا سکے گی؟

7۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اسکو ذہنی یا جسمانی طور پر ہراساں نہیں کیا جائے گا؟ اس ضمن میں رونگٹے کھڑے کرنے والے افسوس ناک واقعات کا تذکرہ تو آئے دن خبروں میں ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بظاہر ترقی یافتہ، مغربی ممالک میں بھی عورتوں کے اپنے اعلیٰ افسران کے ہاتھوں تشدد کا شکار ہونے کے واقعات بھی کثرت سے منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کام کرنے کی جگہ پر عورتوں کے ساتھ بالعموم امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، اور جنسی بنیادوں پر ان کو اکثر و بیشتر اپنے مرد کولیگز کے مساوی مراعات اور ترقیاں نہیں دی جاتیں۔

8۔ایک خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ مسلسل اخلاقی تنزل اور معاشرتی بگاڑ کے رجحانات کا مشاہدہ کرتے ہوئے مسلمان عورت کو work place میں کسی قسم کے تشدد کا نشانہ بننے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے؟

جبکہ عام طور پر Employers خواتین کی نسبت مردوں کو ملازمت دینے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ انکا خیال ہوتا ہے کہ مرد ملازمین عورتوں کی نسبت زیادہ ذمہ داری اور باقاعدگی سے کام کرتے ہیں اور چھٹیاں بھی کم مانگتے ہیں۔ جبکہ عورتوں کو ذہنی اور جسمانی مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ مثلاً ایام یا حمل وغیرہ۔

9۔خواتین کو بلاعذر کام سے فارغ کرنے کے واقعات بھی کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں، جن کا سدباب ضروری ہے۔ (اسی طرح یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ مردوں کو اعلیٰ عہدے اور (Respectable) پوزیشن میں ملازمت دی جاتی ہے جبکہ عورتوں کو بطور سیکرٹری یا سیلز اور مارکیٹنگ کے شعبوں میں ملازمت دی جاتی ہے جہاں صنفی امتیاز اور جنسی استحصال زیادہ کیا جاسکتا ہے۔)

10۔ بہر حال ان تمام تر سوالات کے ساتھ ساتھ، جو سوال ازل سے ہمارے ذہنوں میں انتشار پیدا کیے ہوئے ہے وہ یہی ہے کہ:

کیا اپنی اقدار وروایات کو قائم رکھتے ہوئے معاشرے میں مسلمان عورت کے کردار کو محض گھر کی چار دیواری ہی تک محدود رکھنا چاہیے، یا پھر اس کو گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے گھر سے باہر کام کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے؟

اسی سوال کو ایک دوسرے انداز میں بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ:

کیا ایک ملازمت پیشہ مسلمان عورت، واقعتاً، عملی طور پر اپنی گھریلو ذمہ داریاں کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے؟

کیا ایک ملازمت پیشہ ماں جو کہ گھر سے باہر سارا دن کام کر کے تھک ہار کر گھر لوٹتی ہے اور جس نے دن بھر دفتر کے ناسازگار ماحول میں منفی اور غیر اخلاقی رویوں کا سامنا بھی کیا ہو، گھر پہنچتے ہی اپنے بچوں کی جسمانی وروحانی ضروریات کا خیال احسن طریقے سے رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟

اسی طرح یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ایک نوجوان ملازمت پیشہ بیوی اپنے جواں سال شوہر کی ضروریات کو کس حد تک پورا کرسکتی ہے، جبکہ شوہر بھی لامحالہ بجا

طور پر اس بات کا متقاضی ہو کہ وہ اس کی اپنی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ، اس کے گھر کو بھی سنوارے رکھے اور اسکے کاموں کو ذاتی توجہ بھی دے۔ کیا ایک ملازمت پیشہ بیوی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ان تمام تر امورِ خانہ داری کو اپنے گھر کے باہر کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ کامیابی سے انجام دے پائے؟

مسلمان خواتین کو ترقی یافتہ و بااختیار بنانا، آسمان کی حدوں کو چھونے کا خواب:

میری نظر میں مسلمان خواتین کا عوامی و معاشرتی دائرہ کار میں بہت مرکزی کردار ہے، اور کوئی شرعی پابندی ایسی نہیں جو کہ مسلمان عورت کو مسلمان مرد کے مساوی کوئی بھی معاشرتی کردار ادا کرنے میں رکاوٹ بنتی ہو۔ حتیٰ کہ بعض خواتین میں تو ایسی غیر معمولی خداداد صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں کہ وہ تو مردوں سے بھی بڑھ کر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

اسی لیے میرا یہ ماننا ہے کہ مسلمان عورت کو ''آسمان کی حدوں کو چھونا ہے'' ایک باصلاحیت اور تربیت یافتہ مسلمان عورت اس بات کی اہل ہو سکتی ہے کہ اس کو حکومت میں اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا جائے۔ وہ بخوبی کسی عدالت کی قاضی، حکومتی وزیر یا مشیر، یا تاجر کی خدمات انجام دے سکتی ہے۔

حتیٰ کہ مخصوص حالات میں بشرطیکہ وہ اپنے رفیق کار مردوں کے مقابلے میں زیادہ اہل تر ہو تو علماء تو یہاں تک بھی اجازت دیتے ہیں کہ مسلمان عورت اسلامی حکومت کی سربراہ بھی بنائی جا سکتی ہے۔

بہر حال جیسا کہ قرآن کا حکم ہے کہ جب بھی کسی معاملے میں تنازعہ ہو جائے تو اس کو قرآن کی طرف لوٹا دو اور وہاں سے رہنمائی حاصل کرو۔ اس کے ساتھ ہی نبیؐ کی ذات میں چونکہ ہمارے لیے مکمل نمونہ پیش کر دیا گیا ہے تو ہمیں وہاں سے بھی رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔

اس ضمن میں میں نے حتی الامکان قرآن و سنت کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور مجھے کوئی واضح حکم ایسا نظر نہیں آیا جو کہ مسلمان عورت کی معاشرتی ترقی و عملی کردار کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہو۔

قرآن کریم میں مسلمان عورت کا کردار و مقام:

جہاں تک قرآن میں عورت اور مرد کے کردار متعین کیے گئے ہیں، اس میں کہیں دونوں کے درمیان صنفی بنیادوں پر کوئی تفریق نہیں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس قرآن تو مساوات مرد و زن کا سب سے بڑا داعی

ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ التوبہ کی آیت 71 میں فرماتے ہیں:

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔''

اسی آیت کو میں نے اپنے تحقیقی مقالے کی بنیاد بنایا ہے اور اسی سے نتائج اخذ کیے ہیں۔

اس آیت میں مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے یکساں و مساوی کردار متعین کیے گئے ہیں۔ اس آیت میں محض عبادات یعنی نماز و زکوٰۃ ہی کی بات نہیں کی گئی بلکہ اس سے بڑھ کر معاشرتی و سیاسی ذمہ داریاں بھی مرد و عورت پر یکساں طور پر عائد کی گئی ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ مرد اور عورت دونوں پر یکساں طور پر عائد کر دیا گیا ہے۔ اور بڑے واضح انداز میں مسلمان مرد و عورت پر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی پیروی میں سماجی و سیاسی دائرہ کار میں مساوی کردار وضع کر دیا گیا ہے۔

ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست تو ایک بامشقت جد و جہد کا راستہ ہے جس میں عوام الناس سے میل جول، معاملات، جوڑ توڑ حتیٰ کہ سازشیں اور خطرات تک کا سامنا رہتا ہے۔ اور بے پناہ ذہنی اور جسمانی قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس کو ایک لحاظ سے ایک مستقل کشمکش یا محاذ آرائی یا جنگ کی کیفیت بھی تصور کیا جا سکتا ہے اور عمومی رائے تو یہی پائی جاتی ہے کہ صنف نازک اس طرح کے کاموں کے لئے موزوں نہیں یا ان کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

جبکہ قرآن کی مذکورہ بالا آیت تو عورتوں پر بھی مسلمان مردوں ہی کی طرح نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کا فریضہ عائد کرتی ہے اور سیاسی محاذ میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ کردار ادا کرنے کا پابند کرتی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا معاشرتی کردار:

معاشرتی بالخصوص سیاسی میدان میں حضرت عائشہؓ کا کردار ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ وہ ایک ایسی باصلاحیت مومنہ خاتون تھیں جنہوں نے سیاست میں عملاً حصہ لیا اور سماجی دائرہ میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ آپؐ کی محبوب زوجہ تھیں اور خاندان رسالتؐ میں شمولیت کے مختصر عرصہ بعد ہی آپؐ نے قرآنِ پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔

پھر آپؐ کی ہدایت پر وہ قرآن وسنت کی معلّمہ ومبلغہ کے کردار ادا کرتی رہیں۔ اور عامۃ الناس کو قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ فقہ کے مسائل کی بھی تعلیم دیتی رہیں۔ خاص طور پر خواتین سے متعلقہ امور پر تو ان کو عبور حاصل تھا۔ وہ فقہی امور کی ماہر قانون دان مانی جاتی ہیں اور اپنے ہمعصر علماء میں آپؓ کو نمایاں مقام حاصل تھا (آپؓ کا شمار مدینہ منورہ کے علمائے دین میں تیسرے نمبر پر کیا جاتا تھا)

آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں فرمایا:

''اپنے دین کے معاملے میں آدھی تعلیمات تمہیں اس سرخ چہرے والی خاتون سے حاصل ہوں گی۔''

(تقریباً ایک تہائی صحیح احادیث مسلمان خواتین سے مروی ہیں جن میں سے زیادہ تعداد حضرت عائشہؓ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔)

جب آپؐ کا وصال ہوا، اس وقت حضرت عائشہؓ مدینے کی سیاست اور امورِ حکومت میں بھر پور حصہ لیتی تھیں۔ بعدازاں انہوں نے ان لوگوں کی بھی عملی سر پرستی کی جو یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ حضرت علیؓ کی اولین ذمہ داری حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو تلاش کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ہے۔ اور جب حضرت علیؓ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو حضرت عائشہؓ میدانِ جنگ تک میں آن پہنچیں اور انہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف ایک بڑی فوج کی سپہ سالاری تک کے فرائض انجام دیئے۔ یہ جنگ تاریخ میں جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس میں حضرت عائشہؓ بذاتِ خود شریک ہوئی تھیں اور جمل یعنی اونٹ پر سوار تھیں۔ (اگرچہ حضرت عائشہؓ کی شرکت کی اطلاع پر حضرت علیؓ ذاتی طور پر جنگ میں مخالف گروہ کی جانب سے شریک نہ ہوئے اور اس جنگ میں دونوں اطراف سے مسلمانوں کا ناقابل تلافی نقصان ہوا جس پر حضرت عائشہؓ تاحیات ملول رہیں اور دونوں جانب سے نیتوں کے اخلاص کے باوجود اس کو ایک سیاسی غلطی کہا جا سکتا ہے)۔

بہرحال ان تمام واقعات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ ایک بہترین داعی، عالمہ، مبلغہ، قانون دان، فقیہہ، سیاسی لیڈر اور سپہ سالار

ہونے تک تمام کردار احسن طریقے سے سرانجام دیتی رہیں۔

قرآن کی ایک اورآیت میں مومن مردوں اورمومن عورتوں کو کچھ اس انداز میں مساوی کردار عطا کیے گئے ہیں:

’’جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد وہو یا عورت ، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کروائیں گےاورآخرت میں ایسےلوگوں کوان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔‘‘ (سورۃالنحل 97)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ پیمانہ اورکسوٹی بہم پہنچا دی ہے جس کی بنیاد پر مرد وعورت کے اعمال کو آخرت میں جانچا جائے گا اور بتا دیا گیا ہے کہ یہ پیمانہ یکساں ہوگا اوراس میں کوئی جنسی امتیاز یا تفریق ہرگز نہیں ہوگی۔ یعنی قرآنی تعلیمات میں خالصتاً عقیدۂ مساواتِ مردوزن کی بنیاد پر اعمال کی جانچ پڑتال اورجزا وسزا کا نظام وضع کیا گیاہے۔حتیٰ کہ انجام کار اوراجر کے لحاظ سے بھی مرد وعورت کے درمیان کوئی امتیازی سلوک روانہیں رکھا گیا اورعمل کا دائرہ کار لامحدود رکھا گیا ہے اورکسی مخصوص جنس (Gender) کی بنیاد پر کسی نیکی کے کام میں کوئی پابندی نہیں لگائی گئی اور ہرطرح کے نیکی کے کاموں کے دروازے مومن مردوں اورمومن عورتوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رکھے گئے ہیں۔

اسی طرح قرآن میں ایک اورمقام پرفرمایا گیا ہے:

’’بلاشبہ جومرداور جوعورتیں مسلم ہیں،مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں،راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں،صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں،اوراللہ کوکثرت سے یادکرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کررکھا ہے۔‘‘ (سورۃالاحزاب 35)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پرمسلمان مردوں اورمسلمان عورتوں کے مخصوص اوصاف کو مساوی ویکساں طور پر بیان کردیا ہے اورکہیں کوئی تفریق نہیں کی۔ یعنی ان اوصاف کے حامل ہونے اورپھران ذمہ داریوں کوبھرپورطریقے سے ادا کرنے میں مردوزن کے درمیان کوئی فرق روانہیں رکھا گیا۔ حالانکہ ان اوصاف میں سے بیشتر کا تقاضا ہے کہ اس

میں عوامی دائرہ کار میں شمولیت اختیار کرنا ہوگی۔ مثال کے طور پر صرف ''صدقات'' دینے کے معاملے کو ہی لے لیجیے۔ زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کے لئے لازم ہے کہ پہلے تو کسی عورت کے تصرف میں ذاتی طور پر کچھ مال موجود ہو۔ اس مال کے موجود ہونے کے لئے عوامی دائرہ کار میں مال کمانے کی بھی گنجائش موجود ہے۔ بیشک وہ تجارت یا ملازمت کے ذریعے یا کسی بالواسطہ یا بلاواسطہ طریقے سے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے شادی کے بعد بھی عورت کو حق ملکیت دیا ہے اور اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ وہ تجارت یا کوئی اور کام کرے، اور اپنی مرضی سے اپنے مال کو خرچ کرے، مسلمان عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے خاندانی نام ہی کے ساتھ منسلک رہے اور اس کے مطابق اپنے پیشے یا تجارت کو جاری رکھے۔ اس کیساتھ ہی یہ بات اہم ہے کہ اسکے شوہر کو اس کے مال پر تصرف کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا سوائے اس کے جو عورت خود برضا وخوشنودی اپنے شوہر یا گھروالوں پر خرچ کرے۔ اور کفالت کی بھی کوئی ذمہ داری عورت پر کسی طور عائد نہیں کی گئی۔

سنت نبویؐ کی روشنی میں مسلمان عورت کا مقام وکردار:

آپؐ کو تو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا۔ اور خاص طور پر عورتوں اور بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین تو آپؐ کی تعلیمات کا خاصہ ہے۔ آپؐ آخری وقت تک معاشرے کے کمزور طبقوں بالخصوص عورتوں کی حمایت کرتے رہے۔ حجتہ الوداع کے موقع پر بھی اپنے خطاب میں عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص وصیت فرمائی۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ عورتیں، مردوں کی رفقاء اور قریب ترین ساتھی ہیں۔ اور خود اہم معاملات میں بھی عورتوں کو شریک مشورہ رکھتے اور اہم وزارتی عہدوں پر فائز کرتے۔

☆ شفاء بنت عبداللہ جو کہ ایک نوجوان مسلمان خاتون تھیں۔ آپؐ نے ان کو مدینے کی تجارتی منڈیوں کا نگران مقرر فرمایا۔

☆ ام حرم بنت ملہان انصاریہ کو آپؐ نے اپنا مشیر مقرر فرمایا اور صرف ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر تشریف لے جاتے بلکہ بعض اوقات قیلولہ کا وقت بھی وہاں گزارتے اور آرام فرماتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر

جبکہ آپؐ ان کے گھر آرام فرما رہے تھے تو آپؐ نے ''الرّ ویا''، یعنی ایک خواب دیکھا کہ آپؐ کے کچھ ساتھی بحری بیڑوں پر سوار ہیں اور سمندر میں سفر کرتے ہوئے مختلف علاقوں کو فتح کر رہے ہیں۔ ام حرم نے یہ خواب سن کر فوراً ہی آپؐ سے سوال کیا کہ میں بھی ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہوں گی؟ تو آپؐ نے جواب دیا کہ ہاں تم بھی ان میں سے ایک ہوگی۔ اور پھر یہ پیش گوئی سچی ثابت ہوئی۔

اسی طرح جب آپؐ کو معراج کے موقع پر آسمانوں کے مشاہدات کروائے گئے تو آپؐ اپنی ایک رشتہ دار خاتون ام حانی کے گھر پر آرام فرما تھے۔

اسی طرح اسلام کے اول اول قبول کرنے والوں میں جن مرد و خواتین کا تذکرہ ہمیں ملتا ہے وہ آپس میں حجاب و پردہ کے احکامات کے نزول سے قبل آزادانہ میل جول رکھتے تھے۔ اور حجاب کی آیات کے نزول کے بعد بھی مسلمان خواتین آپؐ کی مجلسوں میں مسجد نبویؐ میں شامل ہوتی تھیں۔ اگرچہ ان کی نشستیں مردوں کے پیچھے ہوتی تھیں۔ پھر بعد ازاں انہوں نے آپؐ سے الگ مجالس/مخصوص مجالس کا مطالبہ بھی اس بناء پر کیا کہ پیچھے بیٹھ کر ان کو آپؐ کی آواز کی سماعت میں مشکل ہوتی تھی اور ان کے لئے آپؐ کو متوجہ فرما کر کوئی سوال پوچھنا ممکن نہیں ہو پاتا تھا۔

عصرِ حاضر میں مسلمان عورت کی حیثیت کا سوال کیوں؟:

دو انتہائی اہم وجوہات کی بناء پر مجھے اس متنازعہ اور پیچیدہ موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

پہلا اہم توجہ طلب عنصر:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جدید اسلامی تحریکوں میں اس مخصوص مسئلہ پر کوئی اتفاق رائے (Consensus) موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس، اس موضوع پر انتہائی مختلف النوع آراء موجود ہیں جن پر مزید تحقیق و مباحث کی اشد ضرورت ہے۔

بعض موجودہ اسلامی تحریکوں نے اس مسئلے پر قدامت پسندانہ رویہ (conservative approach) اپناتے ہوئے مسلمان عورت کو روایتی چادر اور چار دیواری تک ہی محدود کر کے رکھ دیا ہے، اور اس کے باہر معاشرتی زندگی میں اس کے کسی عملی کردار کی کوئی گنجائش بھی نہیں رکھی۔

ان کے خیال میں اگر مسلمان عورت کو کوئی معاشرتی کردار سونپ دیئے گئے تو گھر کا ادارہ تباہی کا

شکار ہوجائے گا اورنسلِ نو کی تعمیر و تربیت کا فریضہ خطرناک حدتک متاثر ہوجائے گا۔ان کا ماننا ہے کہ مسلمان عورت کا گھر سے باہرنکل کرمعاشرے میں کوئی پیشہ ورانہ خدمات ادا کرنا سراسر مغرب کی نقالی ہے اورا س کا انجام اسی طرح سے بالآخر معاشرے کا اخلاقی زوال اورتباہی ہے،جیسا کہ اس وقت مغربی معاشرے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اس گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن کا منشا یہی ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں ٹِک کربیٹھی رہیں اور زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی سج دھج دکھاتی ہوئی معاشرے میں نہ پھرتی رہیں۔وہ سورۃ الاحزاب کی آیت سے یہ عمومی اصول اخذ کرتے ہیں کہ مسلمان عورت کا اصل میدان ،مقام اوردائرہ کار اس کا گھر ہی ہے۔ان کے مطابق اگرچہ سورۃ الاحزاب کی آیت 32-33 میں بظاہر آپؐ کے گھر کی خواتین کومخاطب کیا گیا ہے لیکن اصلاً یہ عمومی اصول ہیں جن کا اطلاق تمام مسلمان عورتوں پر ہوتا ہے۔ان کے نزدیک یہاں نبیؐ کی خواتین کومخاطب کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہیں عمومی مسلمان عورتوں کے لئے مثال اورنمونہ ہونا چاہیے تھا۔اوراس کی یہ بھی دلیل ہے کہ یہ آیت نبیؐ کے گھرانے کی خواتین کونماز اورزکوٰۃ کی تاکید کررہی ہے جبکہ یہ تاکید صرف انہی خواتین سے مخصوص نہیں ہے۔اس لیے یہ بات واضح ہے کہ اگرچہ یہ آیت مبارکہ نبیؐ کی بیویوں اوربیٹیوں کومخاطب کرتی ہے مگراس کا مکمل مقصود عمومی ہی ہے۔اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس حکم کے بعد نبیؐ کے گھرانے کی خواتین بیرونِ خانہ سرگرمیوں سے بالکل مجتنب ہوگئیں۔کیونکہ بعدازاں اسی سورت کی ایک آیت ازواج وبناتِ نبیؐ کو عام مسلمان عورتوں کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے گھر سے باہر جانے کے لیے لباس کے احکام دیتی ہے۔

’’اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اوراہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے اوپراپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تا کہ وہ پہچان لی جائیں اورنہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفوروحیم ہے۔‘‘ (الاحزاب 59)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبیؐ کے گھر کی خواتین کو مطلقاً باہر نکلنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ باہر نکلنے کے لئے ضروری احتیاطیں ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی اوراسی اصول کا اطلاق عام مسلمان خواتین پر بھی کیا گیا۔لہٰذا یہاں اصل اہمیت مسلمان عورتوں کی appearance

Public کو روکنے کی نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ اگر وہ باہر جائیں تو اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ:

۱۔لباس اور انداز واطوار میں باوقار انداز اختیار کریں۔

۲۔حجاب اختیار کریں جس کا مطلب کھلا ڈھیلا ڈھالا لباس (مثلاً چادر، عبایہ وغیرہ۔مترجم) ہے جو ایسا باریک اور چست نہ ہو کہ جسمانی ساخت جھلکے۔

۳۔اپنی زینت اور دلکشی، زیورات اور آرائش وغیرہ ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو چھپ نہ سکتی ہو۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں۔

قدامت پسند (conservative) اسلامی تحریکوں کے نزدیک اگر مسلمان عورت کے گھر سے باہر کام کرنے کی کوئی گنجائش دے بھی دی جائے تو بھی وہ اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتے کہ جس جگہ وہ کام کرے وہاں اختلاطِ مردوزن کا کوئی امکان بھی موجود ہو اور وہ ایسے کسی بھی اختلاط کو غیر شرعی قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ مسلمان عورت کے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی اجازت کو اس بات کے ساتھ مشروط کرتے ہیں کہ ان کا قطعی طور پر مردوں کے ساتھ میل جول نہ ہو۔ دوسری شرط ان کی طرف سے یہ عائد کی جاتی ہے کہ مسلمان عورت کے گھر کے باہر کی ذمہ داریوں یا مصروفیات کی وجہ سے اس کے گھر کے اندر کی ذمہ داریاں کسی طور متاثر نہیں ہونی چاہئیں۔

اس کے برعکس پروگریسو سوچ کی حامل اسلامی تحریکوں کا مؤقف یہ ہے کہ مسلمان عورت کے گھر سے باہر نکل کر معاشرتی امور میں عملاً حصہ لینے میں کوئی شرعی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ آخر کار مسلمان عورت کے فریضۂ تعلیم کے حصول کا مقصد ہی کیا رہ جاتا ہے اگر اسے میدانِ عمل میں اتر کر کوئی کردار ادا ہی نہیں کرنا۔

اس گروہ کی سوچ یہ ہے کہ گھر کے کام کاج کے لئے حسبِ استطاعت عورت کا ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کو مدد کے لئے بھی متعین کیا جا سکتا ہے اور سنتِ نبویؐ کی پیروی میں مردوں کو بھی گھر کے کاموں میں اپنی عورتوں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرنی چاہیے اور ساتھ ہی اس بات کو بھی سمجھنا چاہیے کہ امورِ خانہ داری کے ساتھ ساتھ، ایک پڑھی لکھی Professional مسلمان خاتون کے input کی معاشرے کو کتنی ضرورت ہو سکتی ہے اور اس کے ذریعے معاشرے کو کتنا فائدہ پہنچایا

جاسکتا ہے۔

ترقی پسند (Liberalist) اسلامی تحریکوں کی اکثریت ایسے مردوخواتین پر مشتمل ہے جو کہ مغربی یا مغربی انداز کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں اوراس وجہ سے مغربی طرزِ معاشرت سے مانوس بھی ہیں۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس Exposure کی وجہ سے ان کا Vision وسیع تر ہو گیا ہے اور وہ کھلے ذہنوں سے تیزی سے بدلتی ہوئی جدید دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی عورت کے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کو بالکل فطری عمل تصور کرتے ہیں۔

موجودہ معاشی مشکلات کی بنا پر نوجوان مسلمان شوہر بھی اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان کی بیویاں معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں ان کی مدد کریں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے دور میں پورے خاندان کو چلانے کے لئے محض ایک فرد کی کمائی کافی محسوس نہیں کی جاتی۔ اسی وجہ سے اکثر اوقات شوہر اور بیوی مکمل اتفاقِ رائے سے عورت کی ملازمت کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اس گروہ کا مدّعا ہے کہ اگر کوئی خاندان ایک اوسط معیار زندگی کو بھی برقرار رکھنے میں ناکام ہو جائے، تب بھی تو خاندان کے تمام افراد کی زندگیاں منفی طور پر متاثر ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے اور مسلسل معاشی حالات کی تنگی سے ازدواجی تعلقات اس حد تک متاثر ہو سکتے ہیں کہ نوبت طلاق تک بھی پہنچ سکتی ہے اور کئی زندگیاں بیک وقت تباہی کا شکار ہو سکتی ہیں۔

ایسے حالات میں جبکہ عورت معاشی بوجھ بٹا رہی ہو، مسلمان مردوں کو حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے تمام تر گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اکیلی عورت پر ڈالنے کے بجائے، اس کی دیگر معاشرتی ذمہ داریوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے گھر کے اندر کے کاموں میں اس کو گنجائش اور سہولت دینی چاہیے۔

اسی طرح مسلمان عورت پر بھی لازم ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو خوش مزاجی کے ساتھ سرانجام دے اور گھر سے باہر کی ذمہ داریوں اور مصروفیات کو گھر کے اندر کے کاموں اور ازدواجی تعلقات پر اثر انداز نہ ہونے دے۔

دوسرا اہم توجہ طلب عنصر:

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ ''مسلمان عورت کی بااختیاری'' (Empowerment)، درحقیقت مغربی طرزِ زندگی کے اثرات ہی کا شاخسانہ ہے۔ یہاں تک یہ بات بھی ماننا

پڑے گی کہ مسلمانوں کا خاندانی نظام بھی مغربی طرزِ زندگی سے متاثر ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ پوری دنیا عالمگیریت (Globalization) کے شکنجے میں جکڑی گئی ہے اور اسی کے اثرات مسلم معاشروں کے اندر بھی واضح طور پر رونما ہورہے ہیں۔

یہی عالمگیری نظام دراصل مغرب کا ایجا دکردہ اورمہلک ترین ہتھیار ہے، جس کے ذریعے وہ پوری دنیا پر اپنا کنٹرول جمانے کی کوشش کررہا ہے (اور بظاہر کامیاب بھی ہوتا دکھائی دے رہا ہے) اور خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک اس کا اولین ہدف ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی دنیا کی استعماری طاقت کا زورنوآبادیاتی علاقوں (colonies) پرٹوٹنے لگا، اوران میں سے اکثر میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑ لیا، جس کی بدولت بالآخر مغربی استعماری نظام کا قبضہ مشرقی دنیا پر سے ختم ہوتا دکھائی دینے لگا۔

نتیجتاً یورپ اورامریکہ آج اقتصادی اور معاشی بحرانوں کے دہانے پرآن کھڑے ہیں اوراسی سے بچنے کیلیئے عالمگیریت اور New word order کے نظریات تراش کر تیسری دنیا پر پھر سے اپنی اجارہ داری قائم کرنے کیلیئے کوشاں ہیں۔

خاص طور پرامریکہ تواپنی نظریں مشرق وسطیٰ کے تیل وگیس کے ذخائر پر گاڑے ہوئے ہے اور ساتھ ہی مشرقی ومغربی افریقہ کے تیل ومعدنیات کے ذخائر بھی امریکہ کی نظروں میں ہیں۔

Globalizaion اور New World Order یعنی نئے عالمگیری نظام کے ذریعے استعماری قوتیں پھر سے پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ اسی تسلط کی راہ ہموار کرنے کے لئے مسلمان عورت مغرب کا ہدفِ خاص ہے۔ مغربی طاقتیں اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مسلمان عورت پراثر انداز ہوکر وہ پورے مسلم معاشرے کومتاثر کرسکتے ہیں کیونکہ مسلمان عورت پورے معاشرے کی سوچ وعمل کی سمت کومتعین اور تبدیل کرنے کی طاقت وصلاحیت رکھتی ہے۔ عورت ہی دراصل کسی بھی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ عورتیں کل آبادی کا بھی تقریباً نصف حصہ ہوتی ہیں اورآبادی کے دوسرے نصف پر بھی اثر انداز ہونے کی قابلیت رکھتی ہیں۔

عورت خواہ کسی بھی روپ میں ہو۔ وہ ماں، بیوی، بیٹی اورسماجی کارکن کی حیثیت میں معاشرتی سرگرمیوں کا اصل محرک ہوتی ہے۔ خاص طور پر مسلمان عورت پر

آئندہ نسلوں کو پروان چڑھانے کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اس کا شعور بھی رکھتی ہے اور اس معاملے میں بہت حساس بھی ہے۔ اسی وجہ سے دوران بیسیوں صدی مغرب نے مسلسل عالمی کانفرنسوں کے انعقاد کے ذریعے دانشور طبقے (intelligentsia) کی ذہن سازی مخصوص انداز میں کرتے ہوئے خاندانی نظام اور بالخصوص نت نئے نظریات کو پروان چڑھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن کی سماجی کانفرنس ہو یا قاہرہ کی آبادی کانفرنس وغیرہ، ان سب کا مقصد ذرائع ابلاغ کے ذریعے پراپیگنڈہ کرنا ہی ہوتا ہے۔

''عورت کی آزادی'' اور ''حقوق نسواں'' اور ''Women Empowerment'' کے خوبصورت فریبی نعروں کے پس پردہ درحقیقت نئے تصورات کو تخلیق کیا جارہا ہے اور اس سوچ کو پروان چڑھایا جارہا ہے کہ عورت کو مرد کی بندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے اور اس سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کانفرنسوں میں بالخصوص مسلمانوں کے روایتی خاندانی نظام کو بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا گیا، اسکو دقیانوسی اور حقیر کہہ کر دھتکارا گیا اور اسکے بالمقابل جدید خاندانی نظام کا ایسے نئے انداز میں تصور پیش کیا گیا جس میں غیر شادی شدہ عورت/ ماں یا اکیلے مرد (جو بچہ گود لے لے) کا خاندان بھی تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس جدید خاندانی نظام میں ہم جنس پرست جوڑے بھی معیوب نہیں سمجھے جاتے بلکہ ہم جنس شادیوں کو بھی خوب بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ اور مغربی ممالک میں سے بعض میں تو پارلیمنٹ کی قانون سازی کے ذریعے سے ان کو جائز بھی قرار دے دیا گیا ہے۔

اس نوعیت کے تشویشناک حالات مسلم دنیا میں رہنے والے مسلمانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان تمام مسائل پر نئے سرے سے کھلے دل اور ذہن کے ساتھ غوروفکر کریں اور مسلمان عورت کے معاشرتی کردار کے ضمن میں موجودہ اسلامی تصورات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں۔ شرعی قوانین کی روشنی میں وسعت نظری کے ساتھ عوامی دائرہ کار میں عورت کی شرکت کی حدود وقیود اور ضابطوں کو بھی از سر نو وضع کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

جدید دور کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لئے اب اس بحث کا خاتمہ کر دیا جانا چاہیے کہ مسلمان عورت کا

دائرہ کار اور اولین ذمہ داری اس کا گھر ہے اور اس کو بنیاد بنا کر اس کے معاشرتی کردار کو حقیر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہمارے دین نے تو مسلمان عورت کو بھی اسلامی نظام میں مسلمان مرد کی ہی طرح اسلامی معاشرے میں اپنی انفرادی حیثیت سے کارکن بنایا ہے اور اس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عورت کے گھریلو کردار پر بحث کرتے کرتے ہم نے اس کو اس کی اصل سے کئی گنا بڑھا کر ہی پیش کر دیا ہے۔ بہر حال ایک مسلمان عورت کو اللہ نے تو گھر کی ملکہ بنایا ہے نہ کہ گھر کی ملازمہ۔

اسی طرح ایک مسلمان بیوی کی حیثیت قطعاً اپنے شوہر کی خادمہ کی نہیں ہے۔ اس وجہ سے مسلمان عورت پر گھر کے کام کاج، صفائی، کھانے وغیرہ فرض نہیں کیے گئے۔ اگر شوہر صاحبِ استطاعت ہو تو شرعی قوانین اس کو اس بات کا پابند کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کے لئے ملازم کا بندوبست کرے۔ قرآن کریم میں مسلمان بیوی کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کو پیار، محبت اور سکون دے۔ اس کی اولاد کی ذہنی وجسمانی نشوونما کا خیال رکھے اور اپنے خاوند سے ایسا مودّت کا تعلق قائم کرے کہ وہ اسی کے پاس رہنے کو ہر چیز پر ترجیح دے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تعلقِ زن وشوہر کا تذکرہ فرماتے ہوئے گھریلو کام کاج کے بارے میں تلقین نہیں فرمائی بلکہ باہمی مودّت ورحمت اور ایک دوسرے سے سکون حاصل کرنے کی اہمیت اجاگر فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اور اسکی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں۔'' (الروم۔21)

اس آیت میں تین بنیادی باتیں سمجھائی گئی ہیں۔

ا۔ ''اسکن'' کے معنی ہیں شوہر اپنی بیوی کے پاس سکون حاصل کرے اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوشی محسوس کریں۔

۲۔ ''جعل بینکم'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ نے شوہر اور بیوی دونوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کیا ہے۔

۳۔''مودّت ورحمت''سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان شوہراور بیوی کے درمیان انتہائی محبت کا مضبوط رشتہ قائم کردیا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان بیوی کا کردار گھر کی ملازمہ کانہیں بنایا گیا بلکہ وہ تو اپنے شوہرکو مائل (Attract) کرنے والی اوراس سے محبت کرنے والی اوراس کواس حدتک خوش رکھنے والی ہونی چاہیے کہ شوہراس سے جدارہنا گوارا ہی نہ کر سکے۔

(اسی آیت کی تشریح میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ خالق کا کمالِ حکمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک ہی صنف نہیں بنائی بلکہ اسے دوصنفوں (sexes) کی شکل میں پیدا کیا، جو انسانیت میں یکساں ہیں،جن کی بناوٹ کا بنیادی فارمولا بھی یکساں ہےمگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت،مختلف ذہنی ونفسی اوصاف اورمختلف جذبات وداعیات لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ اورپھر ان کے درمیان یہ حیرت انگیز مناسبت رکھ دی گئی ہے کہ ان میں سے ہرایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے،اور ہرایک کا جسم اور اس کے نفسیات وداعیات دوسرے کے جسمانی ونفسیاتی تقاضوں کامکمل جواب ہیں۔مترجم)

سوڈان حکومت کی طرف سےعورتوں کی ترقی کے لئے کیے گئےاقدامات:

سوڈانی حکومت نے مسلمان عورت کو بااختیار بنانے کے لئے جولائحہ عمل اختیارکیا ہےوہ بالیقین بہت ہی متاثرکن اورانقلابی ہے۔اس کے چیدہ چیدہ پہلو درج ذیل ہیں:

1۔سب سے پہلے تو عورتوں کو بآسانی یونیورسٹی میں داخلہ حاصل ہوجاتا ہے۔خرطوم یونیورسٹی سمیت تمام دیگر یونیورسٹیوں میں اس ضمن میں خواتین کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔

ان کوسائنس اورانجینئرنگ سمیت تمام شعبہ جات میں داخلے کے مردوں کے برابر مواقع حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت سوڈان کی یونیورسٹیوں میں عورتوں کی تعداد60 فیصد کے قریب ہے اور اس میں مزید اضافہ ہورہا ہے۔

2۔دوسری بات یہ ہے کہ تمام حکومتی اداروں کے دفاتر میں خواتین کومردوں کے برابر ملازمت کے مواقع فراہم کیے گئے،سوائے اس کے کہ عملی مشکلات کی بناپر کوئی خاتون خود ہی سے معذرت کرلے مثلاً کسی دور درازعلاقے میں ملازمت ملنے پرمعذرت۔

3۔ عورتوں کو اعلیٰ حکومتی عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے۔ مثلاً ممبر پارلیمنٹ، عدالتوں کی جج، علاقائی یا مرکزی حکومت میں وزیر وغیرہ۔ ان کو بینکوں میں بھی ملازمت دی جاتی ہے۔ اس وقت سوڈانی پارلیمنٹ میں عورتوں کی تعداد 450 ممبرز کا 25 فیصد ہے۔ خواتین کو سینئر وزیر بھی مقرر کیا جاتا ہے۔

اختتامی کلمات:

سوڈان میں مسلمان خواتین کی ترقی کے مزید امکانات موجود ہیں۔ ان کا تجزیہ درج ذیل ہے۔

ا۔ تاحال مسلم آبادی میں اس قدامت پسندانہ رویے کا عنصر غالب ہے کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہی ہے۔ اسی لیے اس سوچ کو اتنی پذیرائی حاصل نہیں ہو رہی کہ عورت کا کوئی پیشہ ورانہ معاشرتی کردار بھی ہونا چاہیے۔ یہی روایتی سوچ عورت کی تعلیم و ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہے۔ آخر عورت کی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کا مقصد ہی کیا ہے اگر اس کو عملاً کہیں کام کرنے کی اجازت ہی حاصل نہیں ہوگی؟

۲۔ عوامی دائرہ کار میں جنسی تشدد: تاحال جنسی تشدد کا (Sexual Harrassment) سوڈانی معاشرے میں کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اس کے باوجود بھی شوہر اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان کی بیوی گھر کے حصار ہی میں بحفاظت بیٹھی رہے اور باہر نکل کر کام نہ کرے۔

۳۔ ناسازگار ماحول: بعض اوقات کام کرنے کی جگہ کا ماحول عورت کی ذہنی وجسمانی صحت کے لئے ناسازگار ثابت ہوتا ہے، خاص طور پر ماں کی صحت کے لئے، کیونکہ وہ نہ تو بچوں کو اپنے ہمراہ کام پر لے جاسکتی ہے اور نہ ہی کام سے چھٹی لے کر ان کی دیکھ بھال پوری طرح سے کرسکتی ہے۔ لہٰذا وہ مستقلاً دباؤ کا شکار رہتی ہے اور اس کی صحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۴۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کام کرنے کے حوالے سے سخت قوانین بنائے جاتے ہیں اور حاملہ یا چھوٹے بچے والی عورتوں کو مناسب چھٹیاں نہیں دی جاتیں جس سے ان کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۵۔ آخر میں خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات کا مسئلہ بہت سنگین ہے اور جب بھی عورت گھر کے حصار سے نکل کر عوامی دائرہ کار میں قدم رکھتی ہے تو وہ لامحالہ منفی رویوں کے سامنے Expose ہوجاتی ہے اور اس کے تشدد کا شکار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے

ہیں، خواہ وہ محض زبانی تشدد (Verbal Abuse) ہی کی حدتک ہو یا پھر سنگین جسمانی تشدد (Sexual Violence) کی حدتک بڑھ جائے۔ بہرحال اسکو مسلمان عورت کے معاشرتی و پیشہ ورانہ کردار کی راہ میں حائل ایک بنیادی اور معقول رکاوٹ تصور کیا جاسکتا ہے۔عورتوں کو پیشہ ورانہ زندگی اپنانے سے روکنے کا رجحان خواتین خاص طور پر دیہی علاقوں کی خواتین کی تعلیم و ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔نیز عورتوں میں غربت اور جہالت کے اضافے کا ایک بڑا اسبب بھی ہے۔

عرضِ مترجم:

ے کیسے ممکن ہے کہ حالات کی گتھی سلجھے
اہلِ دانش نے بہت سوچ کر الجھائی ہے

اس مقالے سے یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ مسلمان عورت کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلامی حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے عملی کردار ادا کرنے میں کوئی شرعی ممانعت یا رکاوٹ موجود نہیں ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کی پیدائش اور تربیت و پرورش کی اہم ترین ذمہ داری بھی مسلمان عورت ہی کے کندھوں پرڈالی ہے، جسے کسی طورنظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

پھر دونوں طرف کا بوجھ (یعنی گھر اور گھر سے باہر کا) ڈال کر مسلمان عورت کو بھی انہی مسائل کا شکار کرنا جن کا آج مغربی عورت کو سامنا ہے، ہرگز مقصود ومطلوب نہیں ہوسکتا۔ گھر کے باہر کام کرنے والی مسلمان عورت کی کیفیت اس شمع کی سی نہیں ہونی چاہیے جو دونوں طرف سے جلادی جائے اور یوں جلد ہی گھل کر ختم ہوجائے۔یعنی ذمہ داریوں کے درمیان توازن قائم کیا جائے اور حسبِ ضرورت عورت کو دونوں محاذوں میں گنجائش اور سہولت دینے کا نظام وضع کیا جائے۔

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اسلامی روایات کو فروغ دیتے ہوئے Early Marriages کو پھر سے رواج دیا جائے اور پھر شادی کے ابتدائی سالوں میں مسلمان عورت کی تمام تر توجہ اس کے گھر پر مرکوز رہے اور وہ بچوں کو جنم دینے اور ان کی پرورش کرنے کے فرائض سرانجام دے۔

اگر اس طریقے کو رواج دیا جائے اور سولہ سے اٹھارہ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کردی جائے تو تیس سے چالیس سال کی عمر تک وہ اپنی بنیادی گھریلو ذمہ

داری یعنی پرورش وتربیتِ اولاد کو کسی حد تک انجام دے چکی ہو گی اور شوہر کی ازدواجی ضروریات بھی اس نوعیت کی نہ ہوں گی جو بہت وقت کی متقاضی ہوں۔ عمر کے اس حصے میں آنے والی پختگی اور شعور کے باعث عورت کے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے سے پیچیدہ مسائل کے جنم لینے کے خدشات بھی بہت کم رہ جائیں گے۔

یہ وقت عورت بآسانی گھر سے باہر کسی بھی Professional career کو دے سکتی ہے، بغیر اس کے کہ کوئی منفی اثرات کسی پر بھی مرتب ہوں۔

مسلمان عورت کی حیثیت گھر کی ملکہ، نگران، یا داعی کی بھی ہے اور مرد جس کو کہ قوام وکفیل بنایا گیا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ عورت کو اس کی ضرورت کی ہر چیز اسکے گھر کے اندر ہی فراہم کرے۔ یہ پہلو عملاً معاشرے میں ناپیدسا ہو کر رہ گیا ہے اور مرد اپنی تمام تر گھریلو ذمہ داریوں سے دستبردار ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور یوں صنف نازک پر بے جا ذمہ داریوں اور معاشرتی تقاضوں کا بھی ایک انبار لادا گیا ہے جس کا ازالہ ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

بہرحال یہ ایک پیچیدہ اورانتہائی اہم مسئلہ ہے جس کے لئے اجماعِ امت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ان تمام مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں کوئی نیا لائحہ عمل طے کرنا ہوگا جس کے ذریعے سے ہم مسلمان عورت کو اس کا وہ مقام وکردار دینے میں کامیاب ہوسکیں جو کہ اللہ نے اس کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

حمد

اسی کے در پہ جھکی ہے گردن اسی کا ہونٹوں پہ نام آیا
وہی مکرّم وہی معظّم وہی ہے سب کے جو کام آیا

خدا سب آنکھوں کے روبرو ہے اسی کا چرچا چہار سو ہے
ذرا کسی دل نے کی توجہ تو فوراً اس کا پیام آیا

ہر ایک دل میں وہی بسا ہے ہر اک کا مالک وہی خدا ہے
اسی نے راحت کا لطف بخشا وہی مصیبت میں کام آیا

محبتوں کا وہی ہے مخزن وہیں سے ہر سو بٹی ہے رحمت
بقدرِ گنجائشِ تمنا ہر اک کے حصے میں جام آیا

یہی دعا ہے شہودؔ میری جبیں مری اس کا آستاں ہو
کرم اسی کا اسی کی بخشش کہ مجھ کو حسنِ کلام آیا

(شہود ہاشمی ۔ ریاض)

☆☆☆

نعت

آج اس بزم میں آقاؐ کی پذیرائی ہے
نہ کہے صلی علیٰ وہ بڑا ہرجائی ہے

ایسا کلمہ ہمیں آقاؐ نے عطا فرمایا
جس میں دنیا پہ حکومت کی توانائی ہے

میرا آقاؐ محبوب مرا راہ نما
مصطفیٰؐ نورِ خدا خوگرِ دانائی ہے

میں نے رخ پھیر لیا ہے اسی رستے کی طرف
جس پہ آقاؐ ترے قدموں کی صدا آئی ہے

روزۂ نور پہ حاضر جو ہوا ہے غازیؔ
میرے آقاؐ تیرے مالک کی رضا لائی ہے

(غازی بھوپالی)

☆☆☆

اے رحمت عالمؐ

نجمہ یاسمین یوسف

نالۂ پابندِ نے نہیں ہے   فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

غالبؔ کے اس شعر نے ہمت بندھائی اور اپنی فریاد منظوم کر کے بہ بحضورِ نبی کریمؐ پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ دعا کیجیے بارگاہِ خدا میں قبول ہو جائے۔

اے رحمت عالمؐ شاہِ اممؐ
اے شافعِ محشر دافعِ غم
ہم نے جو کیے ہیں خود پہ ستم
وہ ستم لرزتے ہونٹوں سے
میں آپ سنانے آئی ہوں
سینوں میں خباثت کے رِستے
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

یہ چھیل کپٹ یہ چھین جھپٹ
کرنے پہ تلی ہے گھر تلپٹ
ڈرتی ہوں دورِ جہالت میں
ہم لوگ نہ پھر سے جائیں پلٹ
اس خوف کی کالی آندھی سے
چھٹکارا پانے آئی ہوں
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

سیلاب بلا نے گھیرا ہے
دکھ درد کا ہر سو ڈیرا ہے
دن نکلے بھی تو لگتا ہے
یوں جیسے گھنا اندھیرا ہے
اے نورِ ہدیٰ ! امید کے......
جگنو تارے مانگنے آئی ہوں
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

بد عہدی کے بد خلقی کے
عیاری چوری چغلی کے
دہشت گردی بے دردی کے
خودغرضی کے کم ظرفی کے
جو داغ ہیں دامنِ امہ پر
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

وہ داغ مٹانے آئی ہوں
ایمان ، تحمل ، صدق وحیا
ہے آپؐ کے در کی خاص عطا
قرآن سی نعمت آپؐ نے دی
بیمار دلوں کی ہے جو دوا
پھر ان ہی چمکتے سکّوں سے
دامن بھروانے آئی ہوں
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

چپ چاپ رہوں گی در پہ کھڑی
لگتی ہے لگے اشکوں کی جھڑی
ہو نظرِ کرم اے شاہِ اممؐ
نیّا ہے بھنور میں کب سے اڑی
طوفاں میں ناؤ کھویا کو
رو رو کے منانے آئی ہوں
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

جالی میں پرو دی ہیں آنکھیں
ہر طاق میں رکھ دیں فریادیں
در آپؐ کا چھوڑ کے عالی جاہ
کیوں اور کسی کا در جھانکیں
پژمردہ یاسمیںؔ سے کہہ دیں
خوش کام ہوئیں تیری آہیں
اس خوشخبری خوش نظری سے
تقدیر جگانے آئی ہوں
سینوں میں خباثت کے رستے
سب گھاؤ دکھانے آئی ہوں

ہمارا کیا ہے

ہمارا کیا ہے
ہماری عادت سی ہو چکی ہے
شفق کی بے خواب وادیوں میں بھٹکتے رہنا
گئی بہاروں کو یاد کرنا
فریب خورہ سماعتوں کے فسوں میں رہنا
افق میں تحلیل ہوتے رنگوں کو رتجگوں میں تلاش کرنا
تمام اجڑے ہوئے دیاروں میں خاک ہوتے ہوئے مزاروں پہ جا نکلنا
اور اپنے گزرے ہوئے دنوں کا حساب کر کے کتاب کر کے ملول ہونا
ملول کرنا
ہمارا کیا ہے
ہماری عادت سی ہو چکی ہے
حروف و قرطاس سے الجھنا، الجھتے رہنا
خیال کی بے پناہ وسعت میں گرد ہوتی ہوئی مسافت کی چاپ سننا
کہیں کہیں پہ قیام کرنا، کلام کرنا
خلاء کی نیلی ردا پہ جو کچھ رقم ہوا ہے اسے سمجھنا
سمجھ کے دنیا میں عام کرنا
اور آنے والی تمام نسلوں کے نام کرنا
ہمارا کیا ہے!

(کرامت بخاری)

غزل

خونِ دل آنکھ کے رستے سے بہایا میں نے
سوز دل لب کی ہنسی میں ہے چھپایا میں نے
وار کاری ہیں بڑے میرے عدو کے لیکن
دلِ نازک کو ہے پتھر کا بنایا میں نے
سنگ باری میری قسمت میں ہی کیوں لکھی ہے؟
بارِ گل بھی کبھی سر پر نہ اٹھایا میں نے
کیسے اٹھتے ہیں قدم جانبِ منزل ، دیکھو
عشق کو جام جنوں کا ہے پلایا میں نے
آگ دل کی میری آنکھوں میں اُتر ہی آئی
مدتوں درد کے شعلوں کو چھپایا میں نے
جانے والوں کی مجھے یاد رلاتی ہی رہی!
دل وہ پاگل جسے جتنوں سے منایا میں نے
لڑکھڑائے ہیں قدم جب بھی شبِ غربت میں
تجھ کو اے تازہ سحر روبرو پایا میں نے
چشمِ نم ، سوزِ دروں، نیم شبی ، غم کا ہجوم
تحفہ غم کا تیری فرقت میں لٹایا میں نے
باغباں حالتِ گلشن پہ پریشاں کیوں ہے
سنگ بلبل کے بس اِک نغمہ سنایا میں نے

(شاہدہ سحر)

غزل

نقوشِ رونقِ محفل کبھی مدھم نہیں ہوں گے
ہماری یاد تو ہوگی جہاں پر ہم نہیں ہوں گے

اسی کی یاد میں ہر آزمائش کو سہا ہم نے
کسی بھی زخم پر آنکھوں کے گوشے نم نہیں ہوں گے

صلیب ودار کا قصہ پرانا بھی ، نیا بھی ہے
اگر ہم ہیں تو اس قصے کے راوی کم نہیں ہوں گے

ہم اپنے سوزِ دل سے حق کی شمعوں کو جلاتے ہیں
بگڑتا ہے کوئی ہم پر تو ہم برہم نہیں ہوں گے

تمہیں ہم کیا کہیں تم عشق کی لذت کو کیا جانو
یہاں جاں سے گزرنے پر کبھی ماتم نہیں ہوں گے

صفِ باطل کے صیادوں کو یہ پیغام دے دینا
یہ سر کٹ جائیں گے لیکن کبھی بھی خم نہیں ہوں گے

کتابِ زیست کے ہر باب پر یہ ناز لکھ دینا
اگر اک سانس بھی ساقی ہے تو بے دم نہیں ہوں گے

(روبینہ فرید)

☆☆☆

افشاں نوید

تارِ عنکبوت

جی چاہتا ہے اپنے احساسِ زیاں کو پاکستان کے ہر چوک، ہر چوراہے پر لکھ جاؤں......
بتاؤں کہ ہم کیسے سودے چکا رہے ہیں......خسارے کے بوجھ تلے دبی ایک عورت کی کہانی

جفت عدد کی طرح پے در پے تقسیم کے عمل نے کتنا نڈھال کر دیا ہے اسے۔

ہمارے کالج میں لڑکیاں اسے ''بیوٹی کوئن'' کے اعزاز سے نوازتی تھیں۔ کیسے گہری اداسیوں کے ڈیرے ہیں اس کے وجود پر اب!! آنسو جیسے ٹھہر گئے ہیں اسکی آنکھوں میں۔

اس کا پورا وجود اس کی زبان کے ساتھ ساتھ محو گفتگو ہے۔ کیسا اضطراب، کیسی بے یقینی، کتنا دکھ اٹھا چکی ہے وہ۔ پورے دو عشرے بعد ملی ہوں میں اس کی ماں کے انتقال پر اس سے۔ نیویارک کے شہر ویسٹ چیسٹر سے آئی ہے وہ۔ شادی کے فوری بعد ہی امریکہ چلی گئی تھی۔ اس کی بہنیں جو ہمارے محلے میں رہتی تھیں ان سے گاہے بگاہے خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی اس کی۔ آج کتنے زمانوں بعد ملے ہیں ہم۔ اس کی امی کے انتقال کو 10 روز ہو چکے ہیں۔ کئی گھنٹوں سے وہ بول رہی ہے میں سن رہی ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ایک المیہ یہ ہے کہ اس کے دکھ سننے والا بھی وہاں کوئی نہیں۔

3 بیٹے دیئے ہیں اللہ نے اسے۔ بڑے بیٹے کی 3 برس قبل شادی کی ہے۔ 20 برس کی عمر میں۔ دو بیٹے ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ شوہر روایتی مذہب پسند ہیں جبکہ وہ وہاں ایک اسلامی گروپ سے وابستہ ہوگئی ہے۔ اور گاہے بگاہے دینی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔ ان کی این جی او دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے لئے فنڈنگ بھی کرتی ہے۔ پچھلے سیلاب میں ان کی این جی او امدادی سامان لے کر پاکستان آئی تھی۔

اس کے دکھوں کی کہانی اس کے بیٹے عمر کی شادی سے شروع ہوئی۔ گھر کا ماحول اس نے شعوری طور پر دیندار بنانے کی کوشش کی۔ لیکن پورے سماج اور بالخصوص تعلیمی ادارے تو بچے کو اپنی من پسند شخصیت کے روپ میں ڈھال دیتے ہیں۔ ہائی اسکول میں نہ معلوم کس وقت اس کی دوستی Eva May نامی لڑکی سے ہوگئی۔ وہاں دوستیاں ہونا تو ایسا معیوب نہیں، البتہ دوستیاں نہ

ہونا معیوب ضرور ہے۔ وہ ماضی کے اوراق پلٹتے پلٹتے کہیں دور نکل گئی۔

میرا معصوم بیٹا...... کتنے سپنے تھے میری آنکھوں میں اس کے لئے! کیا بنانا چاہتی تھی میں اسے...... وہ دوستی میں اتنی دور نکل گیا ہے، یہ تو مجھے اسکی فیس بک پر تصاویر دیکھ کر علم ہوا۔ ابھی تو اسکی عمر محض 18 برس تھی۔ ہائی اسکول بھی پاس نہیں کیا تھا اس نے۔

میں نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو؟ بولا کہ میں ایوامے کے بغیر ادھورا ہوں، اس کے بغیر مر جاؤں گا۔ جب میں نے تحقیق کی تو علم ہوا کہ ایوامے تو آرتھوڈوکس یہودی ہے۔ میں نے بیٹے کے فیصلے پر احتجاج کیا تو وہ بولا کہ وہ مسلمان ہو جائے گی۔ دوستی بھی اس حد تک ہو چکی تھی کہ وہ بچی میرے گھر بلا روک ٹوک آنے لگی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر سوچا کرتی کہ بظاہر سندر سی یہ بچی جو میرے بیٹے کی کلاس فیلو ہے کتنا اچھا ہوتا کہ مسلمان ہوتی یا کم از کم یہودی نہ ہوتی۔ لیکن اس عمر کے جذبات، ناسمجھی، ایسا دریا جس کے آگے کوئی بندھ نہیں باندھا جا سکتا۔ کتنی راتیں میں نے اور میرے شوہر نے جاگتے ہوئے گزاریں۔ اس مسئلے پر سوچ سوچ کر ہمارا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ میرے دونوں بیٹے حذیفہ اور حسن بھی گھر کے ماحول کی ٹینشن سے بہت بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ بالآخر ہم نے ایک فیصلہ کر لیا۔

وہ جمعہ کی صبح تھی جب ایوامے اسلام قبول کر رہی تھی۔ ویسٹ چیسٹر کے اس اسلامک سنٹر میں مولانا صاحب اس کو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا علم دے رہے تھے۔ میرے بیٹے عمر کی خوشی ناقابل یقین جبکہ ایوامے کی ماں سیلے جینیفر کی حالت قابل دید تھی۔ لگتا تھا وہ بہت ناخوش ہے۔ وہ مجھ سے نظریں ملانا بھی پسند نہیں کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کو مبارک باد دی تو اس نے پلٹ کر مجھے نیک خواہشات تک شیئر نہ کیں۔ اور اگلے دن ایوامے دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ سادگی سے اپنے ضروری سامان کے ساتھ۔

اس کی ماں اس کا نام بدلنے پر آمادہ نہ تھی۔ میں نے اس کا نام عائشہ رکھا۔ عائشہ بظاہر محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ کہنا بھی مان لیتی تھی۔ میرے بیٹے کے تو خوابوں کو تعبیر مل گئی۔ عائشہ ہائی اسکول کے بعد قریبی چیریٹی کے ایک ادارے سے وابستہ ہوئی اور میرے بیٹے نے تعلیم مکمل کرنے کے لئے یونیورسٹی میں ایکچوریل سائنس میں مزید تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ

کیا۔

بظاہر تو سب کچھ نارمل تھا اس سماج کی روایات کے مطابق۔ البتہ میں محسوس کرتی تھی کہ اس کی ماں سیلے کی دلچسپی اس کی ذات سے کم نہیں ہوئی بلکہ دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں مجھے علم ہوا کہ وہ سینا گاگ (یہودیوں کی مذہبی عبادت گاہ جہاں وہ ہر ہفتہ کو عبادت کے لئے جاتے ہیں) بھی جاتی ہے۔ وہ یہودیوں کے مقدس ایام پر بھی خاص اہتمام کرتی تھی اور اس کی ماں اسے ہمارے درمیان چھوڑنا پسند نہ کرتی تھی خاص مواقع پر۔ میں نے تو پیار سے، محبت سے عمل کے ذریعے اس کے سامنے اسلام کی سچائی رکھی تھی لیکن اس کا تعلق تو Orthodox Jew یعنی یہودیوں میں بھی قدامت پسند یہودیوں سے تھا۔ اصل مسئلہ اس کی ماں کی ذات ہے۔

ایک برس بعد اللہ نے بالکل عمر کے ہم شکل بیٹا اسے عطا فرمایا بیٹے کے نام کے مسئلے پر ایک بار پھر شدید اختلافات سامنے آئے جب میں نے اس کا نام بلال رکھا۔ سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے بیٹے کو بھی عائشہ کے خاندان کی طرف سے۔ عائشہ کبھی کبھی میرا دل رکھنے کو نماز پڑھتی لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں مذہب کو سیکھنے سے۔

اب وہ ویک اینڈ پر بیٹے کو اس کی نانی کے پاس چھوڑ دیتی ہے۔ میرا دل ڈوبتا رہتا ہے کہ اس کی پرورش پر یہ دو متضاد ماحول اور تہذیبیں کس طرح اثر انداز ہوں گی۔ میرے بیٹے کو بھی شدید اختلاف ہو جاتے ہیں عائشہ سے بلال کے مسئلے پر۔ لیکن عائشہ اور بلال اس کی زندگی ہیں۔ لاکھ اختلافات کے باوجود بھی وہ ان سے جدا نہیں رہ سکتا۔

عائشہ ہمارے درمیان رہ کر بھی ہمارے درمیان نہیں ہوتی۔ اس کی ماں مسلسل رابطے میں رہتی ہیں اس سے۔ ابھی تک تو میں پریشان رہتی تھی اپنے بیٹے عمر کی طرف سے کہ کاش اس کی جیون ساتھی اس کے ایمان کی بھی محافظ ہوتی۔ اب مجھے اس سے بڑھ کر بلال کی فکر لاحق ہے۔ وہ گول گوتھنا بلال جب میرے بازوؤں میں سمٹا ہوا ہوتا ہے میں کتنی دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کرتی ہوں اس پر...... شیطان اور اس کی ذریت سے پناہ مانگتی ہوں کہ میرے بچوں کو اغوا نہ کرلیں۔ میرا بیٹا تو اس اغوا کا شکار ہوگیا۔ وہ کیا کرے اسے خود نہیں پتہ...... جب میں بہت آرزدہ ہوتی ہوں تو تنہائی میں اس سے شیئر کرتی ہوں اپنے دکھ تو وہ کہتا ہے کہ کچھ نہیں

ہوسکتا اور آپ عائشہ کے سامنے متنازعہ مسائل کو نہ چھیڑا کریں۔

متنازعہ مسائل...... یہی مسائل تو حقیقی مسائل ہیں! جسم کینسرزدہ ہو تو دل کیسے خوشی منا سکتا ہے؟؟

مجھ سے خوشیاں روٹھ گئی ہیں۔ کل دو، تین یا چار بچے ہو جائیں گے کیا وہ بچے سچ مچ مسلمان بن سکیں گے۔ عائشہ کی ماں جواب بھی اسے ایوا مے کہہ کر پکارتی ہے وہ اور اس کا خاندان کیسے یہ کڑوا گھونٹ پی سکیں گے؟ مجبور تو ہم ہیں مجبور تو میرا بیٹا ہے۔ کل تک عائشہ اسکی کمزوری تھی سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی عائشہ کے بغیر وہ تنہا تھا، آج بلال اس کی زندگی ہے۔ میرا بیٹا اس کا خاندان ہمارا خاندان چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہا ہے۔ ہمارے گھر سے حقیقی خوشیاں روٹھ چکی ہیں۔

ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے ہیں۔ میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں کہ اس سے ہمدردی کرسکوں کہ خسارہ بھی تو کوئی ایسا خسارہ نہیں جس کی تلافی کی کوئی صورت ہو......نسلوں کا ضیاع......اور یہ کوئی کسی ایک گھر کی کہانی تو نہ ہوگی اس سماج میں......میں تو خود اس سے نظریں ملا نہ پا رہی تھی اور اس کے دکھ کی ٹیسیں میں خود اپنے وجود سے اٹھتی محسوس کر رہی تھی اور...... اس وقت میرا بھی ضبط آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلا جب وہ بے قراری سے کھڑی ہوئی اور میرے شانوں کو مضبوطی سے پکڑ کر بولی:

’’جب میں پاکستان آتی ہوں اور ماؤں کو خوش ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں کہ بیٹی شادی ہو کر یورپ جا رہی ہے یا وہاں میرے پاس فون آتے ہیں خاندان والوں کے کہ ان کے بیٹوں کی وہاں تعلیم یا ملازمت کا بندوبست کر دیں تو میرا رواں رواں چیخ اٹھتا ہے کہ سب کو بتا دوں کہ ان روشنیوں کے پیچھے کیسے مہیب سناٹے ہیں......اس چکا چوند کے پیچھے کیسی تاریکیاں ہیں۔ اس معاش کا کیا کرنا جہاں ایمان کا سودا کرنا پڑے۔ ہم تو بچپن سے دعائیں کرتے ہیں نمازوں میں کہ اولادیں قراۃ العین بنیں۔ جب وہ اولادیں آنکھوں کی ٹھنڈک کے بجائے آنکھوں میں آنسو بن کر سما جاتی ہیں، ان لمحوں کی کسک کیسے بیان کی جائے۔ بہت کچھ کھویا ہے میں نے۔ جی چاہتا ہے اپنے احساس زیاں کو پاکستان کے ہر چوک، چوراہے کی دیوار پر لکھ کر جاؤں۔ چیخ چیخ کر لوگوں کو اس سماج کا

اصل چہرہ دکھاؤں۔ہم کس قیمت پر کون سے سودے چکا رہے ہیں۔سنو!تم تو لکھ لیتی ہونا۔وقت ملے تو میرا دکھ بھی لکھ دینا۔‘‘

اور میں سوچنے لگی کہ لفظوں کو لکھنا تو آسان ہے مگر’’احساس‘‘ کو لکھنا کتنا مشکل ہے۔اور جب اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے آئی ڈراپ کی چھوٹی سی شیشی اٹھائی تھی اور سر صوفے کی پشت پر ٹکایا تھا کہ آنکھیں جل رہی ہیں میری......آئی ڈراپ سے آرام آجاتا ہے،اس نے آئی ڈراپ دبایا تو ننھی بوتل کے سرے پر ایک قطرہ نمودار ہو گیا مگر اس دوران پھر اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے تھے اور مجھے لگا تھا کہ آئی ڈراپ پر موجود ننھا سا قطرہ ان دونوں قطروں کو تسلی دے رہا ہے...... کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا!!

☆☆☆

بیج

’’باجی! آپ کی کسی سہیلی کو ماسی کی ضرورت ہوتو بتایئے گا۔ مجھے کام چاہیے!!‘‘ تاج بی بی نے کپڑے دھوتے ہوئے سعدیہ سے کہا۔

کیا کہہ رہی ہو ابھی دو دن پہلے تو کہہ رہی تھیں مجھے زیادہ کام نہیں پکڑنا کیونکہ مجھ سے زیادہ کام نہیں ہوتا۔ مجھے کام کی عادت نہیں ہے۔ پہلی دفعہ کام کر رہی ہوں۔ نہ میری ماں نے کام کیا نہ میں نے کام کیا۔‘‘

سعدیہ نے اس کے وہ سارے جملے ایک ہی سانس میں دہرا دیئے جو وہ کام نہ کرنے کے لئے کہا کرتی تھی۔ سعدیہ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ تاج بی بی کو رکھتے ہوئے ساتھ وقت کی بات بھی کر لی تھی۔ اب ایک گھنٹہ طے ہوا۔ پہلے پہل تو ایک گھنٹے میں جھاڑ پونچھ بھی ہو جاتی اور کپڑے بھی دھل جاتے۔ تاج بی بی مشین میں کپڑے لگا کر جھاڑ پونچھ کر لیتی لیکن اب آہستہ آہستہ وقت گزر جاتا اور تین کمرے کی جھاڑ پونچھ کر کے وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو جاتی کہ میرا گھنٹہ گزر گیا میں جا رہی ہوں۔ اب دوسرے کام پکڑنے کا کہہ رہی ہے لہٰذا سعدیہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنا غصہ قابو میں رکھا۔ سردی کے دن ہیں ابھی ہر کام والی کا دماغ آسمان پر ہوتا ہے۔

سعدیہ نے اسے غور سے دیکھا روئی روئی شکل لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں بھی سرخ ڈورے سے تھے۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ سعدیہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

’’کیا بتاؤں باجی...... میں تو برباد ہوگئی ۔ میرا میاں کہتا ہے کہ میرے پاس تیرے بیٹے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ پہلے تو وہ مہینے کا خرچہ دو ہزار دے دیتا تھا لیکن اب تو دینے سے انکاری ہوگیا ہے۔ کہتا ہے خود کماتی ہو بیٹے کا خرچہ پورا کرو میرے پاس پیسے نہیں...... سارا پیار بھی پہلی کا اور ساری توجہ بھی پہلی کی میرا تو کچھ بھی نہیں...... میں تو اس کی اپنی ہوں وہ تو غیر...... لیکن باجی آج پیسے نے خون سفید کر دیا ہے۔ بیٹا صرف میرا نہیں اس کا بھی تو ہے......‘‘

''کیا مطلب تم دوسری بیوی ہو؟''

تاج بی بی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو تم کو کیا ضرورت تھی شادی شدہ سے شادی کرنے کی؟ اچھی بھلی ہو کوئی دوسرا رشتہ مل جاتا۔''

عورت کسی دوسری عورت کی تعریف کرنے میں ہمیشہ کنجوسی سے کام لیتی ہے۔ سعدیہ نے اچھی بھلی کہہ دیا وہ ہی بہت تھا حالانکہ تاج بی بی کا ناک نقشہ اور رنگ وروپ دیکھ کر ابتدا میں وہ اسے کام پر رکھنے سے ہی ہچکچا رہی تھی۔ ماسیوں میں ایسی ہزاروں میں دو چار ہی ہوتی ہوں گی۔ واقعی اچھی شکل وصورت کی تھی اس کو رشتہ ملنا کہاں مشکل تھا۔ پھر کیوں اس نے کسی ایسے مرد سے شادی کی جو پہلے ہی سے شادی شدہ تھا۔

''باجی ہماری تو بچپن کی بات طے تھی۔ یہ میرا نصیب تھا کہ گاؤں سے شہر آ کر وہ بدل گیا۔ شادی کر لی۔ دو بچے بھی ہو گئے۔ تین چار سال بعد گاؤں واپس آیا برادری والے بڑے غصے ہوئے۔ اس نے ڈر کے مارے مجھ سے شادی کر لی۔''

''ایسے کیسے شادی کر لی۔ تمہارے ماں باپ نے کچھ نہیں پوچھا؟ انہیں اس کی پہلی شادی کا پتہ نہیں تھا؟''

سارے کام چھوڑ کر اتنی لگن سے سعدیہ سوال جواب کر رہی تھی جیسے مسئلے کا حل نکال کر ہی چھوڑے گی۔

''سب پتہ تھا لیکن بچپن کی منگ ٹوٹنا ساری برادری میں بدنامی ہے۔ سو میری شادی اسی سے ہونی تھی۔ ورنہ کوئی نہیں کرتا۔ بھلا ماں باپ ساری زندگی اپنے گھر پر بٹھا کر رکھتے...... انہوں نے تو بوجھ اتار دیا تھا...... سو اتار پھینکا۔'' وہ برتن چھوڑ چھاڑ کر فرش پر بیٹھ گئی، دوپٹے سے منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

''تو تاج بی بی تم کیا چاہتی ہو؟''

سعدیہ کی جرح کی عادت اور حل تک پہنچانے کی لگن سے کاشف بھی عاجز رہا کرتے تھے۔ ہر مسئلے کے چار حل تو فوری طور پر پیش کر دیا کرتی چاہے سننے والا سر پکڑ کر ہی بیٹھ جائے۔ ابھی کل ہی باتوں باتوں میں سبزیوں کی مہنگائی کا حل اس نے گھروں میں سبزیاں اگانا اور ساتھ گوشت کے لیے مرغیاں اور بکرا پالنا قرار دیا تھا۔ ہر خاندان اپنا کھانا خود اگائے...... پھر دیکھئے گا سبزیوں کی قیمتیں کیسے نیچے آتی ہیں۔ پھر کیمیکل کی ملاوٹ والے کھادوں اورن کے اثرات سے بھی جان چھوٹے گی۔ اور پھر ایک فائدہ اور ہوگا ڈپریشن کی

بیماری سے بھی نجات ملے گی۔ آپ کو پتہ ہے نا کہ باغبانی ایک صحت مند مشغلہ ہے۔

لیکن باغبانی کے لئے باغ کہاں سے لایا جائے...... اکثریت تو فلیٹوں یا چھوٹے گھروں میں رہتی ہے۔ کاشف کے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔اس کا حل بھی موجود ہے۔ گملے اور لکڑی کی پیٹیاں......بس اپنا گھر اور اپنا باغ......

''چلو پھر میں کل سے کم از کم ایک ہزار روپے بچت کی مد میں ڈال لیتا ہوں۔'' کاشف اب کھل کر مسکرائے تھے۔

''ہیں......'' سعدیہ کا منہ کھل گیا ''ٹھیک ہے پہلے انوسٹمنٹ تو کریں پھر بچت ہوگی۔ گملے اور بیج وغیرہ کے لئے دو ہزار دے دیں......''

کاشف پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہوا اور باہر کی راہ لی۔ ''پہلے کی ساری اسکیموں کی بچت استعمال کرو۔''

''بی بی آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

تاج بی بی نے سعدیہ کا گھٹنا ہلا کر متوجہ کیا۔

''بس یوں ہی کہ شاید کوئی حل نکال سکوں...... دیکھو بات کرنے سے ہی بات نکلتی ہے اور حل کی کوئی امید پیدا ہوتی ہے۔تمہارا میاں کیا کرتا ہے اور گھر کا خرچ کون چلاتا ہے؟''

وہ بیرا ہے،کہتا ہے میں گھر کا کرایہ اور راشن کردوں گا باقی کچھ نہیں میرے پاس......پہلی بیوی کو ساری توجہ دیتا ہے۔خوب گھومنے پھرنے جاتے ہیں ۔وہ لوگ بن ٹھن کر ہر شام تیار ہوکر نکل جاتے ہیں۔''

''وہ کیا کام کرتی ہے؟''

''باجی وہ بوتیک میں کام کرتی ہے،سلائی کڑھائی وغیرہ...... خوب کماتی ہے لیکن سب کا سب لٹادیتی ہے۔ اچھے اچھے کپڑے، جوتی، میک اپ......خوشبو میاں تو آتے ہی اس کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ بچے بھی اسکول میں پڑھا رہی ہے۔ان کے بھی خوب کپڑے بناتی ہے۔ میرا میاں کہتا ہے مجھے ان کے ساتھ باہر جانا اچھا لگتا ہے۔عزت ملتی ہے۔ تیرے پاس سے تو مجھے بو آتی ہے۔''

سعدیہ نے تاج بی بی کو غور سے دیکھا...... ہاں ظاہر ہے اسے دیکھ کر یہی آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ ماسی ہے۔

''تاج بی بی! گھر جا کر تم نہا دھو کر صاف ہوجایا کرو...... دیکھو صاف رہو گی تو تمہارا میاں بھی تمہاری طرف متوجہ ہوگا۔صاف رہنے میں تو کچھ حرج نہیں ہوتا

بس صابن کا ہی خرچہ ہے نا......''

''باجی صابن بھی تو پیسوں کا آتا ہے......''

اب تم اپنی تنخواہ سے مہینے کے چار صابن تو خرید سکتی ہو...... اچھا چلو ایک کام اور کرو اپنی سوکن سے اس کا ہنر سیکھ لو۔ کچھ سلائی کڑھائی آجائے گی تو تم بھی کچھ دیر بوتیک میں کام کر لینا۔''

تاج بی بی سعدیہ کا شکل دیکھنے لگی ایسے جیسے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔

''کیسی بات کرتی ہیں آپ بی بی......''

تاج بی بی سب باتیں لاحاصل سمجھ کر اٹھی کھڑی ہوئی، وہ تو سعدیہ سے کچھ پیسے کی توقع کر رہی تھی۔

دیکھو تاج بی بی! لڑائی جھگڑا تو کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔تم اپنی سوکن سے دوستی کرو...... اس کے پاس جو ہنر ہے اس کو سیکھو...... بدلے میں اس کا اور اس کے بچوں کا کام کر دیا کرو......لڑائی جھگڑا اور رونا دھونا میاں کے دل میں ہمدردی نہیں دوری پیدا کر دیتا ہے۔ دل لگا کر کام کرو گی تو اور تنخواہ بھی بڑھے گی، کام بھی ملے گا۔ ماں باپ نے کام نہیں کیا لیکن گاؤں میں جو کام ہوتا ہے وہ تو کیا ہوگا نا...... کام میں کوئی برائی نہیں...... نہ بے عزتی ہے......مہنگائی کے جن نے تو بڑے بڑے لوگوں کی بیگمات کو کام پر لگا دیا ہے۔'' بیگمات کا ذکر کرتے ہی سعدیہ کو بیگم ثناءاللہ یاد آ گئیں۔

بیگم ثناءاللہ کا سفید گیٹ والا بنگلہ باہر سے ہی بڑا شاندار لگتا تھا۔ ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں امریکہ میں تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ شوہر ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ باغبانی سے دلچسپی تھی بس اس میں دل لگا لیا تھا۔ بیگم ثناءالہ سے سعدیہ کی دوستی اتنی ہی پرانی تھی جتنی کہ اس محلے میں اس کی رہائش یعنی تین سال پہلے جب سعدیہ نے سامنے والے گھر کا اوپر کا حصہ کرایہ پر لیا تھا۔

سعدیہ کو تین سال پہلے بیگم ثناءاللہ سے ملاقات کا واقعہ یاد آ گیا جب اوپر بالکونی سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے انہیں گیٹ کے باہر چبوترے پر بیٹھا دیکھا۔ بے حد پریشان لگ رہی تھی۔ سعدیہ نے چادر اٹھائی اور باہر نکل کر ان کے پاس پہنچ گئی۔

''کیا بات ہے خالہ جان؟'' سعدیہ نے ان سے پوچھا۔

نئے فرد سے بات کرتے ہر کوئی ہی کچھ گھبراتا ہے۔انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ سعدیہ نے خود ہی اپنا تعارف کرایا ''میں یہ آپ کے سامنے

والے گھر کے اوپر کے حصے میں رہتی ہوں۔ آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں، کیا طبیعت خراب ہے؟‘‘‘

بیگم ثناءاللہ نے ہلکے سے سر ہلایا۔ آج وہ کچھ دیر کو بازار نکلی تھیں واپس آئیں تو پتہ چلا کہ چابی اندر ہی چھوڑ دی ہے۔ شوہر بھی کسی کام سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ بس اسی لیے پریشان تھیں، تھکی ہوئی آئی تھیں کہ گھر میں آرام کریں گی لیکن یہاں تو اندر داخل ہونا ہی مشکل تھا۔

سعدیہ نے انہیں اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ اور ساتھ ہی گھر سے میاں کو فون کرنے کے لئے بھی کہا۔ وہ تیار ہوگئیں۔ کوئی اور راستہ بھی تو نہیں تھا۔ سعدیہ کی ہمدرد طبعیت سے متاثر ہوئیں بس پھر خوب دوستی ہوگئی۔ حالانکہ ان میں اور سعدیہ میں کوئی بات مشترک نہ تھی۔ نہ عمر، نہ مزاج، نہ مال و دولت......سعدیہ محدود آمدنی میں گزارا کرنے والی...... ہر دم کچھ اچھا کرنے اور مشورہ دینے کے لئے تیار لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ وہ کوئی ’’نیک پروین‘‘ کی طرح ہیروئن تھی۔ وہ سارے شوق جو عورتوں میں ہوتے ہیں وہ ساری عادتیں جن سے میاں عاجز آئے ہوتے ہیں کسی نہ کسی حد تک خوب موجود تھیں۔ گھر کی سجاوٹ اور اپنی سجاوٹ دونوں کا شوق تھا۔ مثبت بات یہ تھی کہ ہر وقت کچھ کرنے اور مصروف رہنے کی شوقین تھی۔ لہٰذا نت نئے منصوبے تیار رہتے تھے۔ کسی وقت جب دونوں بچے اسکول میں ہوتے تو کچھ دیر بیٹھ کر وہ سوچتی اپنی زندگی کو بہتر کرنے کے لئے اپنے آپ کو مشورہ دیتی۔ اپنے گھر اپنے شوہر، اپنے بچے اور سب سے بڑھ کر اپنا آپ کیسے بہتر کیا جاسکتا ہے۔ کون کون سی باتیں اور عادتیں ترک کرنی ہوں گی اور کون سی اپنانی ہوں گی۔ گھر اور بچوں کے لئے کیا کرنا ٹھیک رہے گا۔ میاں صاحب کی ناراضگی کم کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے......وہ کون سی باتیں ہیں جن کے ذریعے ان کے چہرے پر مسکراہٹ لائی جاسکتی ہے۔

خیر ابھی تو بیگم ثناءاللہ کی یاد یوں آئی تھی کہ انہوں نے سعدیہ کو بڑے پیار سے بلایا تھا۔ جس کو وہ بھول گئی تھی۔ چلو ٹھیک ہے کام سمٹ جائے تو ان کے پاس جاتی ہوں۔ پھر ادھر ماسی باہر نکلی ادھر سعدیہ نے بیگم ثنا اللہ کے گھر کا رخ کیا۔

’’کیا سعدیہ بہت مصروف ہوگئی ہو، پرسوں فون کیا تھا۔‘‘ انہوں نے شکوہ کیا۔

چلئے ناراضگی چھوڑیئے یہ بتایئے کیسے یاد کیا

تھا خالہ جان......''

''ہوں......سعدیہ میں چاہتی ہوں کوئی کام شروع کیا جائے۔ مصروفیت بھی رہے گی اور آمدنی بھی...... دیکھو خالدہ کو دیکھو کیسا اچھا بوتیک چلا رہی ہے۔خود بھی زبردست کپڑے پہنتی ہے......میں نے تو یہ سوچا ہے کہ اپنے گھر کے لان کے ایک طرف بوتیک اور دوسری طرف پارلر کھول لوں،خواتین کی دونوں اہم ضرورتیں ایک ہی جگہ پوری ہو جائیں گی۔''

''ہوں......''سعدیہ نے گہری سانس لی۔اسے ان کی بات اچھی لگی تھی۔

''خالہ جان! آپ کا خیال تو اچھا ہے لیکن اگر اس کو مزید اچھا بنالیا جائے۔''

''ہاں،ہاں کیوں نہیں، میں نے تمہیں اسی لیے تو بلایا ہے۔''

سعدیہ نے اچھے مشورے کا وعدہ یاد کیا جو بابا جان نے اس سے لیا تھا۔ بیٹا اچھا مشورہ اچھے بیج کی طرح ہوتا ہے۔خوب برگ و بار لانے والا......کبھی اچھا بیج موافق زمین نہ ملنے کے باعث پھوٹ نہیں پاتا لیکن جب کبھی زمین موافق ملتی ہے وہ اپنا اکھوا پھوٹ نکالتا ہے۔ اچھا مشورہ بغیر اپنی کسی غرض کے اور بغیر کسی ڈر خوف کے دے ڈالنا چاہیے۔

''خالہ جان! میرا خیال ہے ظاہری خدوخال کے بجائے باطنی خدوخال سنوانے کا دھیان کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔پھر آمدنی آپ کا مسئلہ نہیں اس دنیا کی کرنسی تو جس قدر ہو کم ہے۔''

''سعدیہ صاف لفظوں میں کہو......''

بیگم ثناءاللہ کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ تو وہ ضرور سمجھ گئی ہیں۔

''دیکھئے نا یہ ننھے بچے قریبی جو کچی بستی میں رہتے ہیں،سارا دن کچھ آمدنی کے حصول کے لئے تھیلے اٹھائے کچرہ کنڈیوں کو کھنگالتے رہتے ہیں۔ان کے لیے تعلیم اور ہنر کا انتظام کر کے پورے پورے خاندانوں کو بہتری کی طرف لایا جاسکتا ہے۔''

مشورہ مان لیا گیا۔اور پھر ایک اچھے مشورے نے اچھے بیج کی طرح کا کام کیا۔زمین موافق کیا ملی حیرت انگیز برگ و بار پھوٹتے چلے گئے۔ابتدائی کلاس کے پانچ بڑے بچوں نے اپنے اپنے کاروبار کر لیے تھے۔کوئی حلوائی تھا،کوئی درزی اور کوئی مکینک لیکن صبح کے اوقات میں دو گھنٹے وہ اسکول کے بچوں کو ضرور دیتے تھے۔تعلیم کے ساتھ ہنر بچوں کو بااعتماد بنا دیتا ہے۔تعلیم

کا مقصد کسی آفس میں بیٹھ کر فائلوں پر دستخط کرنا نہیں ہوتا۔ تعلیم کا مقصد زندگی کے میدان میں سمجھ داری کے ساتھ فیصلے کرنا۔ اپنی خودی کو محفوظ رکھنا ہے۔ اپنے ظاہر کے ساتھ اپنے باطن کو سنوارنا......اور......اور یہ کہ اپنی زندگی کے نصب العین کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔

اپنے چند سالہ دور تعلیم میں سکھائی گئی ان خاص باتوں کو انہوں نے ہیرے جواہرات سے بڑھ کر حفاظت سے اپنے دل میں محفوظ کرلیا تھا اور سب سے قیمتی بات کہ اچھا مشورہ اچھے بیج کی طرح ہوتا ہے جس کو مٹی کے سپرد کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

☆☆☆

زہے نصیب

میری ماموں زاد، میری پیاری بہن عالیہ کمسنی میں ہی بیوہ ہوگئی ہے۔ اگرچہ اسکی عمر ستاون برس ہے لیکن بھلا یہ بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ جب سے میں تریسٹھ سال کی ہوئی ہوں، میں ساٹھ سال سے کم عمر خواتین کو کمسن ہی گردانتی ہوں۔ آج سے پچاس پچپن سال پہلے مجھے یہ عمر بہت طویل نظر آتی تھی اور اپنے بچپن کے دوران اکثر مجھے یہی غم کھائے جاتا کہ کب اتنے ڈھیر سارے سال گزریں گے، کب صدیاں بیتیں گی، کب میری محکومی کے دن تمام ہوں گے، کب میری خودمختاری کا سورج چمکے گا اور پھر میرا شمار بھی معزز و معتبر بزرگوں میں کیا جائے گا۔ اس خواہش کے پس پردہ بزرگوں کا قابلِ رشک مقام تھا۔ اکثر جب چند بزرگ آپس میں مل بیٹھتے، تو ان کا پسندیدہ موضوع ''ہم بچے'' ہوا کرتا تھا۔ وہ بچوں کا تنقیدی جائزہ لے کر انہیں نیک یا بد قرار دے دیتے۔ اگر ایک بزرگ کسی بچے کو نیک کہہ دیتا تو باقی سب اسکی تصدیق کرتے، اگر وہ کسی کو برا کہتا تو سب اس کی تائید کرتے۔ پھر خاندان بھر میں بچے کا چرچا بزرگوں کے مشترکہ اور متفق علیہ اعلان کے مطابق کیا جاتا۔ مجھے بزرگوں کے مرتبے اور اختیارات پر ہرگز اعتراض نہ ہوتا، اگر وہ میرا نام بھی نیکوکار بچوں کی فہرست میں لکھ لیتے۔ لیکن اسے میری بدقسمتی کہیے کہ کمزور یادداشت، بے حد طویل المعر اور مختلف النوع بیماریوں کے حامل بزرگوں سے بھی میرے بارے میں کبھی غلطی سرزد نہیں ہوئی حالانکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔

میری امی کو اکثر ان کے خیرخواہ بزرگ تسلی و تشفی دیتے پائے جاتے۔

''فکر نہ کرو ابھی بچی ہے، سنبھل جائے گی۔''

''بس چند سالوں کی بات ہے...... کڑوا گھونٹ سمجھ کر نگل جاؤ...... بڑی ہو جائے گی تو سمجھ جائے گی۔''

یہ اور بات ہے کہ بزرگوں کے انداز سے صحیح ثابت نہ ہوئے اور اتنے سالوں کے بعد بھی میں سنبھل سکی نہ سمجھ سکی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی عالیہ کی بیوگی کی۔ اس کے میاں کی وفات کو سن کر میرا دل پارہ پارہ ہوگیا۔ عالیہ

نے اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے ہم سب کے دلوں میں گھر بنا رکھا ہے اور ہمارے دل اس کے دکھ سکھ کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر دھڑکتے ہیں۔ پھراس کے میاں بھی دوسروں کے ہمدرد اور خیرخواہ رہے۔ اس لیے ان کی رحلت کئی لوگوں کے لئے ذاتی نقصان بھی بن گئی۔ میں جب عالیہ کے ہاں پہنچی تو اسکی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ایسی بیش قیمت رفاقت کے ٹوٹ جانے پر بکھر سی گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے دلاسہ دوں۔ ویسے بھی غم یا خوشی کی شدید جذباتی کیفیت کے دوران اکثر مجھے موزوں الفاظ نہیں سوجھتے اور پھر میری آنکھیں زبان کی قائم مقام بن کر آنسوؤں کی زبان بولنے لگ جاتی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایسے ہی ایک موقعے پر میری مشکل دوچند ہوگئی تھی۔ ہوا یوں کہ میری ایک ہمسائی کے میاں کی وفات ہوگئی۔ ان کی چھوٹی بہن اپنی آپا کے گلے لگ کر بآواز بلند بین ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھیں،''ہائے آپا! کیسے اچھے تھے میرے دولہا بھائی۔ اورتم تو خوب جانتی ہو کہ تمہارے دولہا بھائی کیسے ہیں۔ میں نے جب اپنے پیارے بھیا کی موت کی خبر سنی تو بے اختیار میرے منہ سے یہی نکلا۔ ہائے کاش! میری آپا بیوہ نہ ہوتی۔ کاش کہ اس کی جگہ میں ہی بیوہ ہوجاتی۔''

اب چاہیے تو یہ تھا کہ میں ان کی زبانی دانی، مختصر بیانی، خوش الحانی اور قدرت وقوتِ اظہار بیاں کی داد دیتی لیکن اس ستائش کیلئے حالات سازگار نہ تھے۔ اس لیے میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

اپنی ہمسائی سے اظہار افسوس کرنا مجھے پہلے ہی مشکل لگ رہا تھا۔ اب صورتحال مزید پیچیدہ ہوچکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زیادہ بڑا سانحہ کس پر گزرا ہے؟ مرحوم کی بیوہ پر یا مذکور کی زوجہ پر؟ اظہار افسوس کس سے کیا جائے؟ کیا دعا کی جائے؟ مرحوم کی مغفرت کی دعا مانگی جائے یا راہِ سلوک میں مذکور کے مقام ومرتبے سے آگاہی وگواہی کے بعد ان کے لئے دارِفنا سے دارِ بقا کی طرف جلد از جلد پرواز کی تمنا کی جائے؟ میرے لیے موزوں دعا کا انتخاب مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔ کس دعا کو مقدم رکھوں اور کس کو موخر کروں؟ کس کوملتوی کروں اور کس کومنسوخ کروں؟

؎ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں!

اسی طرح میری سسرال کے پڑوس میں میاں بیوی رہتے تھے۔ میاں سخت گیر تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ اکثر میری ساس کے پاس چلی آتی۔ اس

کو دیکھ کر میری ساس ہر کس و ناکس سے ایک مختصر لیکن جامع جملے کے ذریعے اس کی ازدواجی زندگی کے حالات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہتیں۔

''بلّی! اس کے میاں کی موت کے بعد اس کی صحت اچھی ہوگئی ہے۔''

ہاں تو بات ہو رہی تھی عالیہ کی بیوگی کی۔ عالیہ کا غم بانٹنے کی غرض سے ہم بہنوں نے مل کر سوچا کہ اسکی عدت کے دوران ہم باری باری گاہے بگاہے اس کے پاس جایا کریں گے کہ غم کی شدت میں اگر سننے والے کان میسر آجائیں تو دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ بہت چاہتے ہوئے بھی میں اس کے پاس زیادہ نہیں جاسکی کیونکہ میرے اور اس کے گھر کے درمیان خاصا فاصلہ ہے بہرحال کچھ دنوں کے بعد میں نے میاں سے پوچھا کہ اگر وہ کہیں تو عالیہ کے ہاں ایک رات رہ لوں؟ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ میں نے وہاں جانے سے چند دن پہلے ہی حفظِ ماتقدم کے طور پر سعیدہ باجی کو بھی بتا دیا کہ میں فلاں دن عالیہ کے ہاں چلی جاؤں گی اور پھر واپسی دوسرے دن شام کو ہوگی۔ اس وقت انہوں نے بھی خوشدلی سے کہا۔

''ہاں ہاں ضرور جاکر رہو اسکے پاس۔''

چنانچہ عالیہ کے ہاں جانے سے پہلے علی الصبح میں نے کھانا تیار کرکے رکھ دیا اور جانے کیلئے تیار ہوگئی۔ میرے میاں نے مجھے وہاں چھوڑنا تھا۔ وہ گاڑی سٹارٹ کرنے کے لئے باہر نکلے تو سعیدہ باجی نے اپنے کمرے سے مجھے آواز دی۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ عین وقت پر کہیں وہ مجھے روک نہ لیں۔ اور پھر وہی ہوا جس بات ڈر تھا۔ میں ان کے کمرے میں گئی تو وہ کہنے لگیں۔

''دیکھو! وہاں رات نہ ٹھہرنا اور شام کو واپس آجانا۔''

میں نے پوچھا۔

''کیوں خیریت تو ہے؟''

وہ کہنے لگیں۔

''بھئی! کل میرے مرحوم میاں کی برسی ہے۔ اس لیے کل میرا سارا دن بے حد اداس گزرے گا اور میں یہ دن گھر میں تنہا نہیں گزار سکتی۔ لہٰذا تم ضرور واپس آجانا۔''

میں نے کہا کہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل ہم دونوں گھر میں ملکر ایسا سماں باندھیں گے کہ

؎ آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

وہ کہنے لگیں۔

''بہر حال تم شام کو ضرور لوٹ آنا۔''

ان کے بظاہر اس بے ضرر سے جملے نے اچانک میرے سینے پر بھاری سل رکھ دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے واپسی کی حامی بھر لی اور بوجھل قدموں سے عالیہ کے ہاں چلی گئی۔

ان دنوں عالیہ کے ہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس کی کچھ سہیلیاں بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی جا کر ان کے درمیان بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد عالیہ نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ تو آج یہاں میرے پاس ہی رہیں گی نا؟''

میں نے افسردہ دلی سے اسے بتایا کہ میری خواہش تو یہی تھی۔ اسی لیے آج میں نے صبح صبح گھر کا کام بھی نبٹا لیا تھا لیکن گھر سے نکلتے ہوئے سعیدہ باجی نے مجھے واپسی کا کہہ دیا ہے اس لیے شام کو مجھے واپس جانا ہے۔

اس کی ایک سہیلی نے لقمہ دیا۔ ''بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ آپ ان کے حکم کی پابند نہیں۔ اس لیے دھڑلے سے عالیہ کے پاس رہیں۔''

دوسری بولی۔ ''آپ کی عمر اب ایسی نہیں کہ آپ کے اوپر پابندیاں عائد کی جائیں۔ توبہ توبہ بڑھاپے میں تو ویسے ہی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ انسان کیسے ناروا پابندیاں سہہ سکتا ہے۔''

چند اور خواتین نے بھی اظہار افسوس کے ساتھ ساتھ کارگر مشورے پیش کیے۔ میں اچھی بھلی بیٹھی تھی لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے لگا جیسے ابھی ابھی بڑھاپا کسی گہری کالی گھٹا کی طرح میرے اوپر چھا گیا ہے۔ جیسے واقعی میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ جیسے یہ پابندی میری برداشت سے باہر ہے۔ جیسے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیے بغیر چارہ نہیں۔

پھر میں نے سوچا یہ بھی اچھی رہی کہ خود ان کا جب دل چاہے اور جہاں دل چاہے، بلا روک ٹوک چلی جاتی ہیں۔ ایک دو دن رہ کر لوٹ آتی ہیں۔ جب مجھے ان کے آنے جانے پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تو وہ کون ہوتی ہیں میری آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی۔ ویسے بھی یہ ان کے میاں کی پانچویں برسی ہے۔ اب تو گویا یہ نصف صدی کا قصہ ہوا۔ مانا کہ یہ ان کا بہت بڑا نقصان ہے، مانا کہ اس کی تلافی ممکن نہیں، مانا کہ اس

خلا کو کوئی پر نہیں کر سکتا لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ زندگی کے ایک حادثے کو حرزِ جاں بنا کر ساری زندگی کو مایوسی اور تاریکی میں جھونک دیا جائے اور پھر عزیز واقارب سے بھی یہ توقع کی جائے کہ وہ سراپا ماتم کناں ہو جائیں اور ان کے دوش بدوش آہیں بھرتے رہیں۔ یہ تو جبر ہے، یہ تو زیادتی ہے، یہ ناانصافی ہے، یہ تو استحصال ہے۔

ایسی باتیں سوچ سوچ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں دنیا کی مظلوم ترین ہستی ہوں۔ رہ رہ کر اپنے اوپر ترس آنے لگا۔ بجائے اس کے کہ میں عالیہ کو تسلی وتشفی دیتی، میں خود ہی بیچارگی اور خود ترحمی کا شکار ہو کر رہ گئی۔

شام کو میں بوجھل دل کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ باجی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ کہنے لگیں ''میں تمہاری منتظر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آ جاؤ گی۔''

میں نے کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے کہا ''جب آپ سے واپسی کا کہہ کر گئی تھی تو آنا ہی تھا۔''

اس کے بعد ان سے دو چار رسمی سی باتیں کر کے میں باورچی خانے میں جا کر مصروف ہو گئی۔ رات کو کام سے فراغت ہوئی تو اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی اور سونے کے لئے آنکھیں موندلیں لیکن نیند مجھ سے کوسوں دور چلی گئی۔ میرے سینے میں مدفون باسی ہنڈیا پھر سے جوش کھا کھا کر ابلنے لگی۔ ذہن میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ اگر میں رات عالیہ کے ہاں رہ جاتی تو باجی کیا بگڑ جاتا۔ صرف ایک رات ہی کی تو بات تھی۔

جوں جوں میں سوچتی جا رہی تھی، ان کا ظلم بھی نمایاں ہو رہا تھا اور میری مظلومیت بھی۔ اور بے بسی کے عجیب سے احساس کے ساتھ میں دلبرداشتہ ہوتی چلی جا رہی تھی کہ اچانک میرے وجود کے اندر سے ایک توانا صدا بلند ہوئی۔ کوئی مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''کل جب تم اپنی زندگی کا سفر طے کرنے کے بعد اللہ کے دربار میں حاضر ہو جاؤ گی تو عین ممکن ہے کہ وہ تم سے پوچھ لے کہ میں نے گنے چنے چند دنوں کے لئے تیری طرف ایک مہمان بھیجا تھا کہ تو اس کی دیکھ بھال کرے لیکن تو اپنے فرض سے غافل ہو کر نقاد بن بیٹھی۔ تو نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اس مہمان کو بھیجنے والی ہستی کون ہے اور وہ تجھ سے کیا چاہتی ہے؟ اس مہمان کے ذریعے تیرا اک معمولی سا امتحان مقصود تھا۔ اب تو خود ہی بتا کہ تیری کارکردگی کی بنا پر تجھے کس صف میں کھڑا کیا جائے؟''

اس کے ساتھ ہی میں اٹھ بیٹھی۔ میرے لیے باجی

کی حیثیت تبدیل ہو چکی تھی۔ کہاں تو وہ میرے لیے سراپا بوجھ اور مجھ پر ناروا پابندیاں عائد کرنے والی ناپسندیدہ شخصیت تھیں اور کہاں اب وہ میرے لیے اللہ کی مہمان تھیں۔ زہے نصیب، زہے نصیب کہ اس نے میرے گھر میں مہمان بھیجا۔ زہے نصیب، زہے نصیب کہ اس نے مجھے شرفِ میزبانی کیلئے منتخب فرمایا۔

مجھے اپنی بے صبری، کم ظرفی اور تنگ دامنی کا احساس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ میرا دل بھیگ گیا اور میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سرمہ سا تیر گیا۔

نہ جانے ان قطرہ بھر آنسوؤں میں کیسی قوت تھی، کیا سحر تھا اور کیا فسوں تھا کہ ان کے نمودار ہوتے ہی میرے سینے پر جو پہاڑ سا بوجھ تھا وہ ایکدم سرک گیا۔ میرے دل کا گردوغبار دھل گیا اور میں ہلکی پھلکی ہو گئی۔ میرے سینے میں امید اور نوید کے چراغ جل اٹھے اور میرا دل گنگنانے لگا۔

؎ لوئے لوئے بھر لے کڑیئے، جے تدھ بھانڈا بھرنا
شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نیں ڈرنا

☆☆☆

ماتمِ یک شہرِ آرزو

زندگی میں کبھی کبھی سب کچھ اچانک کتنا بدل جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، کبھی مجھے ہارسنگھار کے ننھے ننھے تارے جیسے نارنجی ڈنڈیوں والے ہلکے پیلے پھول کتنے اچھے لگتے تھے کہ روز شام کو وہ میرے بالوں کی زینت بنتے تھے لیکن اب میرا ان کی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا، گلاب کے کنج ویران پڑے ہیں لیکن مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں جبکہ چند سال پہلے تک میں ان میں خود پانی دیا کرتی تھی، کروٹن کے مختلف اقسام کے پودوں کو ہر ہفتے تمباکو کے پانی سے دھوتی تھی تاکہ ان میں کیڑا نہ لگے، موتیا اور موگرہ ہمیشہ میرے کمرے کو مہکاتے رہتے تھے لیکن بہت دنوں سے میں نے ان کی مہک کو محسوس نہیں کیا۔ شاید کیڑا کھا گیا ہے انہیں۔ رات کی رانی بھی پھولوں اور کلیوں سے محروم ہوگئی ہے، صرف پتے ہی بڑھتے جارہے ہیں۔ پرسوں مالی بابا آیا تھا لیکن میں نے اسے کام کرنے سے منع کر دیا کہ جب زندگی کے سارے اصلی رنگ سوکھ گئے تو پھر یہ خارجی چیزیں کہاں سے میری زندگی کے رنگ واپس لاسکیں گی......

بظاہر میں ایک کامیاب عورت ہوں جس کے پاس دولت بھی ہے اور عزت بھی......لیکن اب تنہائی میرا مقدر ہے۔ دونوں بیٹے اور بیٹی ملک سے باہر اپنی اپنی فیملی میں خوش ہیں لیکن میرے چاروں طرف صرف دھوپ ہے......تنہائی کی دھوپ! میرے میاں حمید اللہ بیگ اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ پچھلے نو برس سے شارجہ میں مقیم ہیں۔ نجانے کیوں میں لاشعوری طور پر ان کا نہ چاہتے بھی انتظار کرتی ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ میری اور بچوں کی سنگت چاہتے تھے تو ہم نے انہیں مایوس کیا۔ تب مجھے لگتا تھا دولت ہی زندگی کی معراج ہے اور میں تھی بھی بہت خوش لیکن ایسا لگتا ہے کہ میں نے کم سمجھی میں یا اپنے حسن اور تعلیم کے نشے میں شوہر کو شریکِ حیات نہ سمجھا بلکہ روپیہ کمانے کی مشین سمجھ لیا......مرد جب پیسہ کمانے باہر چلا جاتا ہے تو عورت خود کو حاکم سمجھ بیٹھتی ہے، مرد کا سال دو سال میں چند ہفتوں کے لئے گھر آنا اور واپس چلے جانا ایک

ایسا نظر نہ آنے والا چکر بن جاتا ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، عورت، بچوں کے ساتھ اکیلی رہنے، من مانی کرنے اور حکم چلانے کی عادی ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ بچے بھی باپ کو بھول جاتے ہیں، البتہ چھٹیوں پر آنے سے پہلے انہیں یاد آتا ہے کہ ایک شخص ہے جوان کی آسائشوں کے لئے دکھ بھوگ رہا ہے، سزا کاٹ رہا ہے، تنہائی کا زہر پی کر اپنوں سے دور رہ کر...... جن کے لئے وہ زندگی کی مسرتیں مہیا کر رہا ہے، وہ اس کو آسائش اور آرام مہیا کرنے والی مشین کا صرف ایک پرزہ سمجھ رہے ہیں۔ میری والدہ کہتی تھیں، بچوں کے جوان ہونے تک باپ کو ان کے سر پر رہنا چاہیے ورنہ وہ خودسر ہو جاتے ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک کہتی تھیں، لیکن انہیں یہ تجربہ نہیں تھا کہ جب عورت شوہر کے بغیر اکیلی رہنے کی عادی ہو جاتی ہے تو اسے چھٹیوں پر آئے ہوئے شوہر کا وجود چند دن بعد اسی طرح ناگوار گزرنے لگتا ہے جیسے کوئی خاص مہمان طویل وقت کے لئے ٹھہر جائے! آسائشیں دراصل وہ بھنور ہیں جس میں سے انسان چاہے بھی تو نہیں نکل سکتا...... کہنے کو آج بھی وہ آرام و آسائش تو مجھے میسر ہیں جن کو پانے کے لئے میں نے شوہر کو کھو دیا لیکن عمر کے اس حصے میں جب اولادیں بڑی ہو کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھتی ہیں تو میاں بیوی ہی ایک دوسرے کے دوست غمگسار اور سہارا ہوتے ہیں۔ یہ کھلی حقیقت جب مجھ پر عیاں ہوئی تو پلوں کے نیچے سے تمام پانی بہہ چکا تھا لیکن مجھے اس کا ادراک بروقت نہیں ہوا، شاید اس لیے بھی کہ میں ایک ٹوٹے ہوئے گھر کی بیٹی تھی......

میری ننھیال نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ میری ماں اور خالہ نے لکھنؤ کے ایک کانونٹ میں تعلیم پائی تھی، نانا سیشن جج تھے۔ انہوں نے اپنی پانچوں اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی، میرے تینوں ماموں غیر منقسم ہندوستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، لکھنؤ میں میرے نانا اور ماموؤں کی بڑی عزت تھی۔ اس وقت چند ہی مسلم گھرانے تھے جو اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج بھیجتے تھے۔ میرے نانا کا زیادہ تر سابقہ انگریزوں سے پڑتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ انگریز کی ترقی کی وجہ ان کی تعلیم ہے، اسی لیے ان کے کہنے پر خاندان کی دیگر لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرنے لگیں لیکن میرے نانا نے اپنی دونوں بیٹیوں کو جدید تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ایک ہوسٹل میں داخل

کروادیا تھا، جہاں اعلیٰ طبقے کی ہندو اور مسلمان لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔

میری ماں گیتی آراء بیگم اور خالہ چمن آراء بیگم بہت دلکش نقوش کی مالک تھیں۔ میدہ شہاب رنگینی اور جدید تعلیم اور تہذیبی رکھ رکھاؤ نے انہیں خاندان بھر میں منفرد بنا دیا تھا۔ میری خالہ کا رشتہ بیرسٹر شمیم احمد کے بیٹے سے طے ہو چکا تھا اور اماں کا ان کے پھوپھی زاد احمد حیات خاں سے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ برصغیر کی تقسیم کی باتیں زور وشور سے ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ میری خالہ نے ابھی گریجویشن مکمل بھی نہ کیا تھا کہ نانا نے ان کا نکاح کردیا، وہ رخصت ہو کر مسوری چلی گئیں۔ نانا نے اماں کے لئے اپنی بہن سے کہا تو پتا چلا کہ احمد حیات خاں نے لندن میں کسی گوری میم سے شادی کر لی ہے اور اب وہ واپس ہندوستان نہیں آئیں گے۔ اس ناگہانی صدمے نے نانا اور نانی دونوں کو بیمار کردیا۔ ملک کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں پریشانی اور بڑھ گئی۔ اماں نے منگیتر کی بے وفائی کو خاموشی سے سہہ لیا لیکن جب انور خالہ کے بیٹے مرتضٰی کا رشتہ ان کے لئے آیا تو انہوں نے انکار کردیا کیونکہ وہ کسی بھی لحاظ سے ان کے جوڑ کا نہیں تھا۔

نانا نے ان کے منع کرنے کے باوجود رشتہ قبول کرلیا اور اماں کا نکاح میرے ابا سے ہوگیا۔ ہونے کو تو یہ شادی ہوگئی لیکن ماں نے اس رشتے کو دل سے قبول نہ کیا۔ میرے ابا صرف میٹرک پاس ہیڈ کلرک تھے، شریف تھے، سید زادے تھے لیکن میری ماں کا دل نہ جیت سکے۔ انہیں اپنی تعلیم اور خوبصورتی پر ناز تھا اور دل میں احمد حیات خاں کی تصویر۔ نتیجہ یہ ہے کہ دو بچوں کی پیدائش کے بعد جب ابا پاکستان آنے لگے تو اماں نے انکار کردیا۔

ابا کے پاکستان جانے کے تین ماہ بعد میرا بھائی مصباح پیدا ہوا تو ابا ایک بار پھر اماں کو لینے لکھنؤ گئے۔ وہاں معاشی حالات بہت خراب تھے، لہٰذا نانا، نانی، میری والدہ ہم تینوں بہن بھائیوں کو لے کر کراچی آگئے۔ یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد والدہ کو ایک کالج میں پڑھانے کی جاب مل گئی لیکن لاکھ کوشش کے باوجود انہوں نے ابا کے ساتھ ان کے گھر میں رہنے سے انکار کردیا۔ میں سب سے بڑی تھی۔ ابا پی ڈبلیو ڈی میں ملازم ہوگئے تھے۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ اماں ساتھ آکر رہیں لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے کیونکہ وہ تین بچوں کے باپ تو تھے لیکن اماں کے

دل میں جگہ نہ بنا پائے تھے۔ وہ ہر اتوار کو ہم سے ملنے آتے تو مجھے بہت پیار کرتے، میں تھی بھی ابا جیسی اورنگہت بنی بنائی اماں تھی، اسی لیے وہ اسے زیادہ پیار کرتی تھیں، پھر ایک دن خدا جانے کیا ہوا کہ میں اسکول سے آئی تو ابا بیٹھے تھے، اماں نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

''آج سے تم اور مصباح اپنے ابا کے پاس رہو گے اور نگہت میرے پاس۔'' یہ کہہ کر انہوں نے دوسوٹ کیس نکال کر ابا کے پاس رکھ دیئے۔ میں رونے لگی، مجھے اماں اچھی لگتی تھیں اور ابا بھی لیکن میں اماں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی کہ آنکھ کھول کر انہیں اور نانا، نانی ہی کو دیکھا تھا۔ ابا تو بس مہمانوں کی طرح کبھی کبھی آتے تھے لیکن اماں نے میری ایک نہ سنی اور ہم دونوں بہن بھائی ابا کے ساتھ آ گئے جہاں دادی بھی تھیں اور پھپھو بھی، بعد میں دادی نے بتایا کہ اماں نے ابا سے طلاق لے لی ہے کیونکہ ان کے پرانے منگیتر اور محبوب احمد حیات خاں لوٹ آئے ہیں۔ ان کی انگریز بیوی انہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے اور بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس وقت اماں کی عمر صرف چھتیس سال تھی اور میں فقط سولہ برس کی تھی۔ مصباح صرف دس سال کا تھا، اس سانحے نے ہماری زندگیوں کو بدل دیا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں دادی، پھوپھی اور ابا کی محبت نے اماں کی یادوں کو دھندلا دیا۔ محبت کی تپش انسان کو اس کے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ اماں کے پاس تو ہمارے لیے کچھ بھی نہ تھا، سوائے وقت پر اسکول کی فیس ادا کرنے کے اور یہاں ابا اور دادی ہمیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ کچھ دن بعد خبر ملی کہ اماں نے احمد حیات خاں سے نکاح کر لیا ہے، نانا پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ اس لیے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ایک دن ابا مجھے، مصباح اور پھوپھو کو کلفٹن لے گئے تو وہاں ہمیں اماں مل گئیں، بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ سنہرے بارڈر کی گہری سبز ساڑھی ان کے گورے رنگ پر بہت جچ رہی تھی۔ ان کے ساتھ ان کے شوہر تھے، بے حد طرحدار اور وجیہہ۔ ابا سے کہیں اچھے اور جامہ زیب، ہم دونوں جونہی اماں کی طرف بڑھے، وہ ہمیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ایک شدید نفرت کی لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ میں نے تہیہ کیا کہ اب کبھی ان کی شکل نہ دیکھوں گی۔

میں کالج سے نکل کر یونیورسٹی میں آ گئی۔ مصباح

نے بی اے کر کے ایک اخبار میں نوکری کر لی۔ دادی کا انتقال ہو گیا اور پھوپھو بیاہ کر سسرال چلی گئیں۔اس عرصے میں نگہت کی شادی ایک پروفیسر سے ہو گئی۔ وہ جرمنی چلی گئی۔اس کی شادی والے دن اماں سے نفرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ کیسی ماں تھی جنہوں نے مجھے جنم تو دیا تھا لیکن کسی ناسور زدہ حصے کی طرح مجھے کاٹ کر پھینک دیا تھا۔انہوں نے کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش کی اور نہ ہی میری شادی کے بارے میں سوچا۔ میں ایک اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ میری ہم عمر ٹیچرز سب شادی شدہ تھیں لیکن میں اب تک کنواری تھی۔ میرا آج تک کوئی رشتہ اس لیے نہ آیا تھا کہ میں حسین ہونے کے باوجود ایک غریب بستی میں صرف باپ کے ساتھ رہتی تھی اور میری ماں نے طلاق لے لی تھی۔ مصباح نے موقع ملنے پر ایک بدصورت امیر لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہ کینیڈا چلا گیا تھا۔ میرے بھی کچھ خواب تھے اور میں ان کی تعبیر شادی کر کے پانا چاہتی تھی۔ایک دن پتا چلا کہ ہماری ہمسائی اکبری خالہ ایک رشتہ لائی ہیں۔کوئی حمید اللہ بیگ ہیں جو کسی فیکٹری میں سپروائزر تھے۔ انہوں نے تصویر دکھائی، ناک نقشہ تو ٹھیک ہی تھا لیکن تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ ابا نے بغیر میری مرضی جانے ہاں کر دی کیونکہ وہ اب بہت بیمار رہنے لگے تھے اور کسی حد تک چڑچڑے بھی ہو گئے تھے۔ان کی خالی زندگی میں تھا ہی کیا؟ یہ رشتہ انہیں یوں بھی پسند تھا کہ حمید صاحب شادی کے بعد ہمارے گھر ہی رہنے والے تھے کیونکہ ان کا کنبہ حیدرآباد میں رہائش پذیر تھا۔

چند رشتہ دار جمع ہوئے اور میں حمید اللہ کی بیوی بن کر رخصت ہو گئی اکبری خالہ کے گھر کیونکہ وہی لڑکے کی سرپرست تھیں۔ اماں ایسی کٹھور کہ میری شادی پر بھی نہ آئیں۔ صرف ایک چمپاکلی اور جھمکے کسی کے ذریعے بھجوا دیئے۔

شادی کی پہلی رات جب میں نے حمید اللہ کو دیکھا تو ایک سناٹا میرے وجود میں اتر گیا۔ وہ بالکل سیاہ فام تھے۔میری سوچ کے بالکل برعکس، مجھے لگا جیسے میرا وجود مٹی سے بنا ہو جو احساس سے عاری ہو۔ زندگی کی گاڑی چل نکلی۔ دو ماہ بعد ابا مر گئے اور میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ حمید انسان بہت اچھے تھے۔ میری تمام ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔اب میں صرف اسکول میں پڑھاتی تھی، ٹیوشن کرنی چھوڑ دی تھی۔ اسی گز کا چھوٹا سا گھر ابا نے ترکے میں میرے لیے چھوڑا تھا۔ جس سے کچھ آسانی ہو گئی تھی۔حمید کا تعلق ایک کاریگر

گھرانے سے تھا۔ انہوں نے انٹرتک ٹیکنیکل تعلیم حاصل کی تھی۔ان کے رشتے داران پڑھ ضرور تھے لیکن بدتہذیب نہیں تھے، سب مجھے بہت عزت دیتے تھے۔ دوسال میں دو بچے میری گود میں آ گئے اور دونوں بیٹے ،تو میرا جی کچھ بہل گیا۔اب میں زیادہ تر وقت بچوں کو دیتی۔ میں نے اب حمید اللہ کا کمرہ الگ کردیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے اس کا وجود کبھی اچھا نہ لگا۔ وہ جب میرے قریب ہوتا تو میں اس کے چہرے کی طرف بالکل نہ دیکھتی۔ میں جان بوجھ کر اس کو ٹھنڈا کھانا دیتی لیکن وہ احتجاج نہ کرتا۔بعض اوقات وہ خود کچن میں جا کر سالن گرم کر لیتا۔صبح میں دیر سے اٹھتی تھی کہ اب میں اسکول بھی نہ جاتی تھی کیونکہ دودو بچوں کے ساتھ ملازمت جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔حمید کے رشتے دار اکثر میرے پاس آتے اور میری دلجوئی کرتے کیونکہ میرا کوئی میکہ نہیں تھا۔اس کی بھابھی میرا بہت خیال رکھتیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ان لوگوں کا آنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا جبکہ میری نند اور جٹھانی میری ایسی سیوا کرتی تھیں جیسے میں کوئی شہزادی ہوں کیونکہ وہ ان پڑھ تھیں اور مجھے اسی لیے عزت دیتی تھیں کہ میں پڑھی لکھی ہوں۔ لیکن میری تعلیم نے مجھے ان کی قدر کرنی نہ سکھائی، میں اپنی علمیت اور گورے رنگ کے گھمنڈ میں ہمیشہ اکڑی رہتی اور ان لوگوں سے بہت ہتک آمیز برتاؤ کرتی ،شاید میں لاشعوری طور پر حمید اللہ بیگ کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ میرے قابل نہیں تھا اور میں نے اس سے شادی کر کے کوئی احسان کیا ہے۔آہستہ آہستہ حمید کے رشتے داروں نے آنا کم کردیا۔حمید خود ہی حیدرآباد جا کر ان سے مل آتے تھے۔ میرا سلوک حمید سے بھی کچھ زیادہ اچھا نہ تھا، میں ٹھیک ٹھاک طریقے سے نظرانداز کرتی تھی۔ دونوں بیٹے بھی باپ سے ذرا دور رہتے تھے۔میں بچوں کو زیادہ اپنے قریب رکھتی تھی پتا نہیں وہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ میری کسی بھی زیادتی پر احتجاج نہیں کرتا تھا بلکہ ہمیشہ میری اور بچوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اس کا احساس آج مجھے ہو رہا ہے جب وہ بہت دور چلا گیا ہے، میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔لیکن ایسا ہوگیا!!

حمید ساری تنخواہ مجھے دے دیتا۔ صرف اپنی ضروریات کے لئے کچھ رقم رکھ لیتا۔ وہ بھی زیادہ تر بچوں پر خرچ ہوجاتے۔ایک دن میرا موڈ ٹھیک دیکھ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ”کیا میں ان کے ساتھ

خوش نہیں ہوں؟'' تب میرا جی چاہا کہ کہہ دوں کہ تمہارے جیسے کالے کوے کے ساتھ مجھ جیسی گوری چٹی خوش شکل عورت بھلا کہاں خوش رہ سکتی ہے لیکن پتا نہیں ، میں کیوں چپ ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ''بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں کہ تم خوش رہو۔ میں تمہیں ہر قیمت پر خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

تب میں نے کہا ''اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو ملک سے باہر ذریعہ معاش ڈھونڈیئے تاکہ ہم اس علاقے سے نکل سکیں اور اپنا شاندار مکان بنا سکیں۔''

اس وقت تو وہ خاموش ہو گئے لیکن تقریباً دو تین ماہ بعد انہوں نے ایک دن مجھے بتایا کہ پندرہ دن بعد وہ جاپان جا رہے ہیں جہاں ان کے جیسے ہنرمندوں کی بڑی ضرورت ہے۔ میں نے پہلی بار خوشی سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور بولے ''ثمینہ! تمہیں دکھ نہیں ہوگا؟ تم اکیلی کیسے رہو گی؟''

''دکھ کیسا؟ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ اب ہمارے بھی دن بدل جائیں گے۔ پھر کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔'' میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

حمید چاہتے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی بہن اور چھوٹا بھائی میرے ساتھ آ کر رہیں لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور یقین دلا دیا کہ میں اکیلی رہ لوں گی کیونکہ محلّہ بہت اچھا ہے۔ سو پندرہ دن بعد وہ جاپان چلے گئے۔

حمید کو گئے دو سال ہو چکے تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے اتنا سرمایہ ضرور بھیج دیا کہ میں ایک اچھے علاقے میں اٹھ آئی اور یہاں فلیٹ خرید لیا۔ پرانا مکان بیچ دیا۔ یہ اسی کی دہائی کی بات ہے۔ جب کراچی کے حالات اتنے ابتر نہ تھے، میں سکون سے فلیٹ میں رہ رہی تھی، میری ملازمت بھی جاری تھی۔ دو سال بعد وہ ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آئے تو ان کی صحت اچھی ہوگئی تھی۔ وہ دیوانہ وار بچوں کو پیار کر رہے تھے اور ان کے لائے ہوئے کھلونے ایک ایک کر کے انہیں دے رہے تھے۔ بچے جن کی عمریں دس اور نو سال تھیں، بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے بھی وہ بہت کچھ لائے تھے۔ وہ ایک ماہ رہ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے ایک سال کے اندر اندر میں ایک بیٹی کی ماں بھی بن گئی۔ بیٹی کا نام مریم رکھنا چاہتے تھے لیکن میں نے اس

کا نام نائیلہ رکھا کیونکہ مجھے یہی پسند تھا......اس بار بچی کی وجہ سے وہ ایک سال بعد ہی آ گئے۔ حمید خاصے ہنر وَر آدمی تھے، وہ کئی کام جانتے تھے۔ اس دفعہ انہیں کسی جاننے والے کے ذریعہ امریکہ کا ویزا آسانی سے مل گیا کیونکہ 1980ء تک پاکستان پر دہشت گردی کا لیبل نہیں لگا تھا اور لوگوں کے خاندان کے خاندان آسانی سے وہاں جا بستے تھے۔ اس دفعہ انہوں نے فیڈرل بی ایریا میں ایک اور بہت اچھا فلیٹ لے کر کرائے پر دے دیا جس کا کرایہ مجھے ملنے لگا۔ میرا فلیٹ اب جدید ترین آسائشوں سے مزین تھا۔ میں نے ایک کار بھی خرید لی تھی اور خود ڈرائیو کرتی تھی۔ اب مجھے ہر ماہ بے چینی سے حمید کے ڈرافٹ کا انتظار رہتا تھا جو وہ پابندی سے بھیجا کرتے تھے۔

آٹھ سال گزر گئے۔ اس عرصے میں بچے بڑے ہو گئے۔ نائیلہ باپ کو بہت یاد کرتی تھی لیکن دونوں بیٹے عاکف اور سہیل نے کبھی باپ کی کمی کو محسوس نہیں کیا، انہیں باپ کے بھیجے ہوئے پیسے سے خریدی ہوئی آسائشیں زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ امریکہ جانے کے بعد دو بار حمید وطن واپس آئے لیکن دونوں بار صرف ایک ایک ماہ رہ کر چلے گئے۔ ان کے آنے سے ہماری معمولات بدل جاتے تھے۔ ایک تو وہ چاہتے تھے کہ میں اور بچے انہیں وقت دیں لیکن ہم سب الگ الگ دائروں میں رہ رہے تھے۔ دونوں بیٹے یونیورسٹی چلے گئے تھے جہاں وہ کیمسٹری اور اکنامکس میں آنرز کر رہے تھے۔ نائیلہ ابھی اسکول میں تھی۔ دونوں بیٹے یونیورسٹی سے آ کر کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں بند ہو جاتے، گٹار بجاتے، ٹی وی دیکھتے یا پھر دوستوں میں نکل جاتے۔ ان کے لئے باپ کی اہمیت دو دن رہتی تھی اور بس......سچ پوچھئے تو میرا بھی سارا ٹائم ٹیبل الٹ پلٹ ہو جاتا تھا اور ایک ہفتے بعد ہی میں دن گننے لگتی تھی کہ حمید واپس کب جائیں گے۔ اس عرصہ میں چار سو گز پر مشتمل ایک بنگلہ میں نے نارتھ ناظم آباد میں بنوالیا۔ دونوں فلیٹ کرائے پر دیئے اور حمید کی موجودگی میں بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ اس طرح پانچ سال اور گزر گئے۔ نارتھ ناظم آباد والا گھر دو منزلہ بن گیا۔

حمید کو گئے بیس سال گزر چکے تھے، زندگی میں اب وہ سب کچھ تھا جس کی میں نے کبھی تمنا کی تھی، دونوں بیٹے اچھی جگہوں پر ملازم ہو گئے تھے۔ نائیلہ کالج میں سیکنڈ ائیر میں تھی، اوپر کی منزل کرائے پر اٹھا دی تھی۔ حمید کے آنے سے ہمارے معمولات بدل

جاتے تھے۔ سب سے زیادہ مجھے ان کا اپنے کمرے میں سونا اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ میں اور نائیلہ رات دیر تک ویڈیو فلمیں دیکھنے کی عادی تھیں جبکہ حمید کو جلدی سونے کی عادت تھی۔ وہ آتے تو خود کو گھر کا سربراہ سمجھتے ہوئے تمام کام اپنی مرضی سے کروانے کے متمنی رہتے جبکہ میں اس بیس سال کے عرصے میں اس بات کی عادی ہوگئی تھی، بچے بھی ان سے زیادہ مانوس نہیں تھے بلکہ وہ ان کے آنے سے ڈسٹرب ہوجاتے تھے۔ چنانچہ ایک ہفتے کے بعد وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے حیدرآباد چلے جاتے اور زیادہ وقت وہیں گزارتے لیکن میں یا بچے کبھی نہ حیدرآباد جاتے نہ ان لوگوں کو اپنے گھر بلاتے۔ اس دوران میں نے چھت پر ایک کمرہ بمعہ اٹیچ باتھ کے حمید کے لئے بنوادیا۔ وہاں ایک ٹی وی رکھ دیا اور ایک کونے میں ایک ٹیبل پر الیکٹرک کی کیتلی اور چائے کا سامان بھی رکھ دیا کیونکہ حمید کو چائے پینے کی کچھ زیادہ عادت تھی۔

اب میرا ارادہ بیٹوں کی شادیاں کرنے کا تھا۔ لڑکیوں کی تلاش جاری تھی۔ میں نے اس کا تذکرہ فون پر حمید سے کردیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ایک ماہ بعد سامان سے لدے پھندے کراچی آگئے اور آتے ہی دھما کہ کیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے آگئے ہیں۔ اب اپنے بچوں اور پوتوں کے ساتھ زندگی کے بقیہ دن گزاریں گے۔ یہ انکشاف سن کر میرا موڈ سخت آف ہوگیا لیکن میں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ البتہ نائیلہ بہت خوش تھی، وہ باپ کو بہت چاہتی تھی۔ بہرحال کچھ دیر کے بعد جب میں نے بیٹوں کے ذریعے ان کا سامان اوپر کمرے میں بھجوایا تو تو وہ چونک پڑے۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ یہ سب ان کے آرام کے لئے ہے۔ وہ چپ چاپ اوپر چلے گئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اور بچوں نے ان سے کہا کہ ابھی مستقل واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی تو بچوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ اس پر حمید نے میری جانب گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''اب تو بچے ملازم ہوگئے ہیں۔ کیا تمہارا اور بچوں کا جی نہیں چاہتا کہ میں ان کے اور تمہارے ساتھ رہوں؟ آخر کو بیس سال کا عرصہ میں نے تم لوگوں ہی کے لئے دیارِ غیر میں گزارا ہے۔'' یہ سن کر دونوں بیٹے سر کھجاتے ہوئے اٹھ گئے اور میں کچن میں چلی آئی۔ البتہ نائیلہ یہ سن کر باپ سے لپٹ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کھانے کے بعد حمید اوپر کمرے میں چلے گئے۔

کئی دن گزر گئے۔ صبح کی چائے حمید خود بنا لیتے تھے۔ البتہ ناشتہ ماسی اوپر دے آتی تھی۔ دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا چند دن تو انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کھایا اور پھر وہ کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا نے لگے۔ میں نے اور بچوں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ ڈائننگ ٹیبل پر حمید اب کچھ اجنبی اجنبی لگتے تھے۔ البتہ نائیلہ اب مجھ سے زیادہ باپ کے ساتھ وقت گزارتی، کالج سے آ کر اوپر چلی جاتی اور اکثر کھانا بھی باپ کے ساتھ ہی کھاتی۔

چند دن بعد میں نے حمید سے کہا ''یہ مکان میرے نام کر دیں اور دونوں فلیٹ دونوں بچوں کے نام کر دیں۔'' تب انہوں نے کہا کہ:

''تم نے نائیلہ کے لئے کچھ نہیں سوچا؟''

''وہ تو بیاہ کر دوسرے گھر چلی جائے گی۔ جب شادی ہو گی تو بہت سا جہیز دے دیں گے۔'' میں نے جواب دیا لیکن شاید میں نائیلہ کا باپ کی طرف زیادہ جھکاؤ پسند نہ کرتی تھی۔ وہ پہلے تو خاموش ہو گئے۔ پھر تین چار دن بعد مجھے اوپر کمرے میں بلا کر بولے......''میں نے پاکستان میں مستقل سکونت کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور سچ پوچھو تو خالی بیٹھ بیٹھ کر میرا جی گھبرانے لگا ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ دوبارہ امریکہ چلا جاؤں۔ میں چونکہ وہاں کا شہری ہوں، اس لیے واپس جانا کوئی مسئلہ نہیں بلکہ اس دفعہ واپس جا کر تم سب کو بھی وہاں بلانے کی کوشش کروں گا تا کہ تم سب کو بھی گرین کارڈ مل سکے۔''

میں تو یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑی اور حمید کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی ''اللہ آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں اور بچے بھی یہی چاہتے تھے۔''

انہوں نے مجھے دیکھا اور ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا جس پر مکیش کا گایا ہوا ان کا پسندیدہ گانا بج رہا تھا، جو وہ اکثر سنتے تھے۔

زندہ ہوں اس طرح کہ غمِ زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں
آنے کو آ چکا تھا کنارہ بھی سامنے
پر اس کے پاس ہی میری نیّا گئی نہیں

میں نے اٹھ کر ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ آف کیا اور ان سے کہا ''چلیں اس خوشی میں آج ہم سب مل کر کہیں باہر ڈنر کریں گے۔''

''تم لوگ چاہو تو چلے جاؤ۔ میرا دل اب اس گوشۂ قفس میں کچھ زیادہ لگنے لگا ہے۔ گویا...... گوشے

میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

اور میں نے نیچے آ کر دونوں بیٹوں کو فون پر یہ خوشخبری سنائی۔ شام کو عاکف اور سہیل دونوں ان کے پاس گئے اور بولے ''بابا! ہمیں آپ کی پسند کا پتہ نہیں ورنہ اس خوشخبری پر ہم ضرور آپ کے لئے کوئی اچھا سا تحفہ ضرور لاتے۔''

حمید نے بیٹوں کو غور سے دیکھا اور بولے ''تمہیں میری پسند ہی معلوم نہیں۔ کیا تمہاری ماں نے کبھی نہیں بتایا کہ مجھے کیا پسند ہے؟'' دونوں بیٹے چپ تھے اور میں بھی...... مجھے واقعی پتہ نہیں تھا کہ ان کی پسند کسی بھی معاملے میں کیا ہے......

اسی وقت پیچھے کھڑی نائیلہ نے کہا ''لیکن مجھے ابو کی پسند معلوم ہے۔''

''کیا ہے؟'' عاکف اور سہیل نے ایک ساتھ پوچھا۔

''شعروادب اور نیم کلاسیکل موسیقی۔'' اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

اگلے دن حمید نے تمام فائلیں منگوائیں اور بولے ''میں چاہتا ہوں کہ امریکہ جانے سے پہلے تم لوگوں کو پی ای سی ایچ سوسائٹی میں ایک بڑا گھر خرید کر دے دوں تاکہ تم بہوؤں کو وہیں بیاہ کر لاؤ۔ کیونکہ تمہیں ہمیشہ سے سوسائٹی کا علاقہ پسند ہے۔''

میں تو یہ سن کر خوشی سے بے حال ہوگئی...... واقعی مجھے ہاؤسنگ سوسائٹی کا علاقہ بہت پسند تھا۔ وہاں میں شادی سے پہلے ایک بنگلے میں ٹیوشن پڑھانے جاتی تھی۔ بعد میں کلفٹن اور ڈیفنس بھی بن گئے لیکن جو ارسٹوکریسی اور نفاست اس سوسائٹی میں محسوس ہوتی تھی، وہ کسی دوسری جگہ محسوس نہ ہوئی۔

حمید نے کرائے داروں کو نوٹس دے دیئے تاکہ فلیٹ اور مکان بیچ کر سوسائٹی میں شاندار بنگلہ خریدا جا سکے۔ ہم لوگ وقتی طور پر ایک کرائے کے گھر میں آ گئے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ میں دونوں فلیٹ اور مکان بک گئے۔ وہ جانے کی تیاریوں میں لگے تھے۔ جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو وہ چند دن کے لئے اپنے بھائی اور بھاوج سے ملنے ہمیشہ کی طرح حیدرآباد جانے کا کہہ کر نکلے کہ وہاں کوئی کام تھا لیکن چار دن گزر گئے، وہ واپس نہ آئے۔ ادھر مجھے اس نئے بنگلہ میں شفٹ ہونے کا انتظار تھا جو میں ان کے ساتھ پسند کر کے آئی تھی۔ دو منزلہ خوبصورت گھر، اوپر کا پورشن دونوں بیٹوں کے لئے اور نیچے میں۔ پانچویں دن مجھے

ایک رجسٹری ملی۔ میں نے جلدی سے کھولا تو ایک خط اور ایک لفافہ نکل کر گر پڑا۔ میں نے جلدی جلدی کھولا۔ پہلے خط پڑھنا شروع کیا جسے حمید نے بھیجا تھا۔لکھا تھا۔

’’ثمینہ!

میں تمہیں اس بندھن سے فوری طور پر آزاد کرتا ہوں جسے تم اٹھائیس سال تک زبردستی اور ناگواری سے برداشت کرتی رہیں۔ میں تم سے محبت کرتا تھا جبکہ مجھے پہلے ہی دن سے تمہاری نفرت کا اندازہ تھا۔ میں تمہارا دل جیتنے کے لئے جاپان گیا، امریکہ گیا لیکن مستقل واپسی کی خبر سن کر تم نے اور تمہارے بیٹوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا، اس نے میرا دل توڑ دیا۔ تمہیں تمام آسائشیں میں نے فراہم کیں اوران آسائشوں کے لیے مجھے کتنی محنت کرنی پڑی، کتنی اذیتیں اٹھانی پڑیں، کتنی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا۔ اگر گنوانے بیٹھ جاؤں تو کئی صفحے درکار ہوں گے لیکن تم لوگوں کو حتیٰ کہ میرے بیٹوں کو بھی ذرہ برابر اس کا احساس نہ تھا۔ تم نے میرے ہی پیسے سے خریدے ہوئے گھر میں مجھے اجنبی کردیا۔ ۱۰x۱۰ کے کمرے میں مجھے کوڑھی کی طرح پھینک دیا۔ گویا میں صرف ایسی مشین تھا جو سکے ڈھالنے کا کام کرتی ہے اور جب ناکارہ ہوجاتی ہے تو کباڑی کو بیچ دیتے ہیں۔ تم نے مجھے بھی کباڑ خانے میں ڈال دیا۔

شکر ہے خدا کا کہ میں نے اپنے ایک دوست کی بات مان کر بینک اکاؤنٹ صرف تمہارے نام نہ کیا بلکہ جوائنٹ اکاؤنٹ رکھا ورنہ تم مجھے چھت پر پھنکوانے کی بجائے ایدھی ہوم بھجوا دیتیں۔ میرے دوست خالد نے یہ مشورہ تمام حالات جاننے کے بعد دیا تھا۔ اس کا کہنا سچ تھا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں اور کسی بھی وقت تمام املاک کی مالک بننے کے بعد مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکوگی۔ حالانکہ تم ٹوٹے ہوئے گھر کی لڑکی تھیں، غربت میں دن گزارے تھے، لیکن میری محبت اور قربانیوں کو تم نے میری بے وقوفی سمجھا۔ بہرحال...... میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم اور تمہارے بیٹے سمجھتے ہیں۔ میں نے تمام املاک بیچ دی ہے۔ تم جس گھر میں ہو اس کا ایک سال کا کرایہ ایڈوانس دے دیا ہے۔ آگے تم جانو اور تمہارے بیٹے۔ ماشاء اللہ وہ اچھی پوسٹوں پر ہیں۔ اب تمہارے بقیہ خواب وہ پورے کریں گے کہ میں نے انہیں اس قابل کردیا ہے...... نائیلہ کا رشتہ طے ہوجائے تو فون

کردینا۔ اس کی شادی کے تمام اخراجات میری ذمہ داری ہے اور ہاں طلاق نامے کے ساتھ ایک لاکھ کا چیک ہے۔ حالانکہ تمہارا مہر محض پانچ ہزار تھا جو میں ایک لاکھ سکہ رائج الوقت کی صورت میں ادا کر رہا ہوں۔

حمید''

......اس کے بعد تنہائی کے طویل نو برس گزر گئے۔ اب میرے ساتھ صرف ملامت اور پچھتاوے ہیں اور اس شہر کا ماتم ہے جسے میں نے خود اجاڑا۔ میری رفیق صرف میری تنہائی ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

(سہ ماہی ''فنون'')

☆☆☆

شکست کے رتھ پر سوار

بیٹی ہو بہو حمنہ کی سی تھی سوائے لانبی گھنی پلکوں کے۔اماں جان کی گود میں دیتے ہوئے فوزان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔امینہ نے بچی کو کاٹ میں لٹاتے ہوئے فوزان کا ماتھا چوم لیا۔

''اللہ تمہیں ہر رشتہ کا حق صحیح طور ادا کرنے والا بنائے۔'' دھیمے سے دعا کرتے ہوئے انہوں نے جھک کر پوتی کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا۔''کتنی ٹھنڈک پڑتی ہے اولاد کو گلے لگا کر اب تم کو بھی معلوم ہوگا۔''انہوں نے مسکراتے ہوئے فوزان کو دیکھا جو بچی کو محبت سے دیکھے جا رہا تھا۔

''پتہ نہیں باپ اولاد سے کیسے منہ موڑ جاتے ہیں۔'' بے اختیار یہ جملہ اسکے منہ سے ادا ہوا تو امینہ کے پورے وجود میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔وہ باپ بن چکا تھا مگر باپ سے محرومی ابھی تک اس کو غمگین رکھے ہوئے تھی۔نشوا اور نشوا کے بعد مونس اور ابراہیم امینہ کے دل کی بہار بن چکے تھے۔فوزان کی ماں سے محبت اور احترام ہی امینہ کو توانا رکھتا تو حمنہ کو بھی شوہر کی خوشنودی کے لئے اپنے مزاج سے ہٹ کر کام کرواتا۔شاید وہ غیر مناسب جرأت دکھا جاتی لیکن فوزان کی مضبوط شخصیت نے لاڈلے بچوں کی ماں اور من چڑھی بیوی ہونے کے باوجود اسے حد میں رکھا۔اور گھر میں اماں جان کی اہمیت اور حیثیت ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی برقرار رہی ورنہ وقت اور گھر دونوں اب فوزان کے تھے۔

فوزیہ کا پردیس سے دو، تین سال بعد مہینہ بھر کے لئے آنا ہوتا تو جیسے ماں میں کوئی نئی روح پھونک دیتا اور حمنہ کو بھی تعاون کے کچھ سبق پڑھا دیتا۔فوزیہ تحائف کے انبار سمیت آتی اور لدی پھندی ہی واپس جاتی۔اب کے وہ آئی تو بضد تھی کہ اماں جان کچھ عرصہ کے لئے اس کے ساتھ رہنے آئیں۔

''امی جی! اب تو نجیب کی پوسٹنگ امریکہ کی برانچ میں ہو رہی ہے۔ویزا ملنا بھی مشکل نہ ہوگا، مان جائیے۔''

اس نے ٹیرس پر شام کی چائے پیتے ہوئے ماں

سے ہمیشہ کی طرح اصرار کیا تو ساتھ بیٹھی حمنہ کا دل امریکہ کا سن کر پھر مچل اٹھا۔ اب تو عرصہ ہوا ہارون ربانی نے بھی کوئی فون نہ کیا تھا۔ شاید وہ بھانپ گئے تھے کہ ان کا چاہا پورا ہونا ممکن نہیں۔ چلتی ہوا کا رخ پہچان لینے میں انہیں کمال تھا، تبھی تو بزنس میں کامیاب اور پھر کامیاب ترین بن چکے تھے۔

''اچھا پھر تو آپ کی پپا سے بھی ملاقات ہوگی۔''

بے اختیار یہ جملہ حمنہ کے منہ سے پھسل گیا۔ کہنے کے ساتھ اسے اپنی حماقت کا بھرپور احساس ہوا جب فوزیہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ماں کو دیکھا جن کے چہرے پر تاسف تھا۔

''ارے امی میں بتانا بھول گئی خالہ جانی کا فون آیا تھا، کہہ رہی تھیں کہ لیلیٰ کے ہاں بیٹا ہوا ہے ماشا اللہ۔''

اس نے فوراً ہی ماں کا دھیان بٹایا اور ٹرے اٹھا کر کچن کا رخ کرتی بھاوج کو دیکھ کر ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ ''ذرا سی لاپروائی نے اماں کو غمگین کر دیا۔'' وہ سوچتے ہوئے ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

''پتہ نہیں یہ اس کو ایسی بات کرنے کی کیا سوجھی۔ لگتا ہے والد صاحب بہو کا دل جیت چکے ہیں۔'' ماں سے باتیں کرتے بھی اس کے دماغ میں یہی چل رہا تھا۔ ادھر حمنہ اپنی نادانی پر واقعی شرمندہ تھی۔ بے موقع بات کہنے پر اسے فوزیہ کی نگاہوں میں اپنا آپ گھٹیا محسوس ہوا تھا۔

''اماں جان! یہ اسی طرح بات کر جاتی ہیں یا اتفاقاً ایسا ہوگیا ہے؟'' فوزیہ نے اچانک ماں سے پوچھا تو وہ چپ رہیں۔

''کافی ڈھل گئی ہے ان بارہ سالوں میں۔ بہت مختلف ماحول سے آئی تھی۔ فوزان کی پسند تھی، ورنہ اتنے مختلف ماحول میں آنا تصادم ہی پیدا کرتا ہے۔'' کچھ لمحوں بعد وہ بولیں تو فوزیہ نے ''ہوں'' کرنے پر اکتفا کیا۔ انداز تو واقعی حمنہ کے خاصے مختلف تھے، بہرحال اس نے بھاوج کو ماں کے ساتھ نباہ کرتے ہی پایا تھا باوجود متضاد انداز فکر کے، یہ ہی اچھائی تمام دوسرے پہلوؤں پر بھاری تھی۔ وہ خود ماں سے دور ہونے کی بنا پر بہت کچھ ٹھیک دیکھنا چاہتی تھی اس لئے اس نے ماں کو کچھ عرصہ کے لئے اپنے ساتھ رکھنے کا تہیہ کرلیا۔ ''شوہر کے بل پر راج کرنے والی عورت کی طاقت ہی اور ہوتی ہے۔'' یہ سوچتے ہوئے فوزیہ کے ذہن میں تین عورتوں کا خیال آیا۔ ماں کا، بھاوج کا

اور اپنا۔

''میری ماں نے تو کبھی یہ لطف اٹھایا ہی نہیں۔''

اس نے ایک بار پھر اپنا ارادہ دل میں پکا کیا اور نشوا کو دیکھنے لگی جو دوپہر کا کھانا چھوڑ کر اب پرنگلز کا ڈبہ تھامے سب کو آفر کر رہی تھی۔ پھوپھی تک آتے آتے ڈبہ آدھا رہ چکا تھا۔ فوزیہ نے چند چپس اس کی خوشی کے لئے اٹھا لیے۔

''پھوپھو جی اور لیجیے نا۔''

''جانو! کھانا تم نے کھایا نہیں، یہ کھانے کا نعم البدل نہیں بن سکتے، اپنے ڈیڈی کی طرح لمبا ہونا چاہتی ہو تو جنک فوڈ پر گزارا نہ کیا کرو۔''

''پھوپھو حارث کتنا لمبا ہو گیا ہے؟'' نشوا نے اچانک فوزیہ کی اکلوتی اولاد کے متعلق پوچھا جو اس بار ماں کے ساتھ نہیں آیا تھا۔

''بہت! بالکل اپنے پپا کی طرح۔'' انہوں نے نرمی سے گال چھوئے۔

''دونوں شرارتی بلے کہاں ہیں؟'' فوزیہ نے گھر میں بھتیجوں کی غیر موجودگی کی بنا پر خاموشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''بوٹنگ کلب کی ممبر شپ لینے گئے ہیں۔ ڈیڈی نے ان کو چیلنج دیا تھا کہ اگر وہ دونوں ایک ساتھ کسی بھی تین مقابلوں میں پوزیشن لے آئے تو یہ ان کا گفٹ ہوگا۔ بے چارے کب سے کوشش کر رہے تھے، آتی ہی نہیں تھی۔ پھر مما نے ان کو ایکسٹرا آرٹ کلاسز دلوائیں تب جا کر تین کیٹیگریز بنیں، ورنہ اسٹڈیز اور ڈرامہ بس ان دو میں ہی پوزیشن آ جاتی تھی۔'' مزے سے پھوپھو سے باتیں کرتے ہوئے وہ چپس بھی چگ رہی تھی۔

''گڈ! قاری صاحب کب آتے ہیں؟''

''آج کل نہیں آ رہے، بہت ٹف ٹائم دیتے تھے۔ مما نے ہٹا دیا کہ کسی دوسرے کو بلا ئینگی قرآن پڑھانے۔''

''ہم سب کو بس دین میں چیزیں ٹف لگتی ہیں دنیا بھی کم ٹف تو نہیں۔'' فوزیہ نے بے اختیار سوچا۔

نشوا سے باتیں کرتے ہوئے اسے بیٹی نہ ہونے کی کمی بہت محسوس ہوئی تھی، وہ تھی ہی محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی، اب بھی پھوپھی کا کرسی سے نیچے لٹکا دوپٹہ کا پلو جھاڑ کر ان کی گود میں رکھ دیا تو وہ مسکرانے لگیں۔

مہینہ پلک جھپکنے میں جیسے گزر گیا تھا۔ میکہ سے

جاتے وقت فوزیہ کا دل ہمیشہ ہی اداس ہوتا تھا، حالانکہ اس کی اپنی زندگی نجیب عبداللہ کے ساتھ خوشگوار تھی لیکن پردیس پردیس ہوتا ہے، نہ خوشی بانٹ سکتے ہیں، نہ غم، نہ ذائقہ رہتا ہے اور نہ رشتوں کی حلاوت، انسان کو اللہ نے کتنے بے شمار رشتوں کی محبتوں کے درمیان پیدا کیا اور پھر پردیس ان سب سے کاٹ کر دل میں خراشیں ڈال دیتا ہے۔

فوزیہ کا بیٹا بھی اپنے چچا کے پاس دمشق جا چکا تھا۔ اس وقت تک حالات وہاں کے خراب نہ ہوئے تھے اور نجیب عبداللہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کچھ برس خالص عربی ماحول میں وقت گزارے تاکہ قرآن کی زبان سے آشنائی دین سے محبت میں ڈھل جائے۔ چودہ سالہ حارث کو برازیل سے دمشق ماں نے کس حوصلے سے روانہ کیا وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ دل کہتا تھا ابھی بہت چھوٹا ہے، دین سیکھنے کے لئے عمر پڑی ہے کیوں اکلوتی اولاد جدا کرتی ہو، یہاں کونسا کفر کا ماحول دے رکھا ہے ہم نے۔ لیکن نجیب عبداللہ سمجھاتے تھے کہ بڑے اور عظیم مرتبے کے لئے انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے، کیا تم نہیں جانتی کہ ہماری اولاد امام المتقین بنے۔ اور وہ یہ سوچ کر چپ کی چپ رہ جاتی کہ واقعی انسان دنیا کی کامیابیوں کے لئے بھی تو اپنے جگر گوشوں کو سخت ٹریننگ دلواتا ہے تاکہ وہ کسی مرتبے پر پہنچ سکیں، تو یہاں باپ حقیقی مستقبل شناس ہے۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میاں کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ یہ شوہر اس کی ماں نے دین کے اصولوں کو سامنے رکھ کر پسند کیا تھا تو پھل بھی اسی حساب سے اسے ملنا تھا، بھائی کے گھر میں اس سے مختلف طریقے دیکھنے میں آتے تھے، ایک آدمی ایک حد تک ہی منوا سکتا ہے، دوسرا اگر مختلف رجحانات کا ہو تو وہ اثرات بھی خاصے نمایاں ہوتے ہیں۔ بیٹی نے مخلوط تعلیمی ادارے میں نہیں پڑھا یہ فوزان کی پالیسی تھی لیکن دس سالہ بچی کو غیر محتاط لباس میں گھر سے باہر لے جانے میں حمنہ کو عار نہ ہوتی تھی۔ حقیقتاً اسے ایسا کرنے میں کچھ غلط ہی نہ لگتا تھا۔ فوزیہ نے دبی زبان سے توجہ دلائی تو حمنہ نے حیرت بھری نگاہوں سے نند کو دیکھا۔

''فوزی! بس یہ ہی تو عمر ہے ایسا شوق پورا کرنے کی، پھر دو، چار سال بعد کون پہننے دے گا، اور پھر بچی ہے ابھی تو۔'' اپنی بات کہہ کر اس نے ایک دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر چیونگم کا پیکٹ اس کے سامنے کر دیا۔

فوزیہ نے اچنبھے سے بھائی کی جانب دیکھا جو بچوں کو اسکول کے فنکشن میں ڈراپ کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ بہن کی نظریں فوزان کو کش مکش میں ڈال گئیں۔

فوزان کو اگر کسی درجہ اختلاف تھا بھی تو فی الحال اس کا دماغ گزشتہ روز سلائی کے کاریگر کے کام چھوڑ کر جانے سے الجھا ہوا تھا۔ کرنل صاحب کی بیٹی کے بوتیک کا ڈھیروں ڈھیر کام آیا ہوا تھا اور عین انہی دنوں ایک اہم ترین کاریگر محض اس لیے کام چھوڑ کر گیا کہ قیمتی کپڑوں کے بچے ہوئے پیس اس کو تھیلی میں بھر کر گھر لے جانے سے روک دیا تھا۔ فوزان کا موقف تھا کہ آدھا گز یا اس زیادہ بچا ہوا کپڑا گاہک کی امانت ہے، ہم اسے رکھنے کے مجاز نہیں۔ اس کی بات سن کر منہ میں بھرا گٹکا وہیں دیوار کے کونے میں تھوکتے ہوئے کاریگر نے اپنے کپڑے جھاڑے اور چل دیا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ اب فوزان کے پاس پھٹکے گا بھی نہیں۔

''اپنے لیے کام بہت، یہ خواہ مخواہ کی کٹ کٹ اپن سے برداشت نہیں ہوتی بائی۔'' طنزیہ لہجے میں بولتا وہ فوزان کو اپنا مالک لگ رہا تھا۔

''جاؤ جاؤ، بوتھا گم کرواپنا یہاں سے تم لوگوں کے ساتھ کتنا بھی اچھا کرو پر تم نے ڈنگ ہی مارنا ہوتا ہے۔'' فوزان بھی پھٹ پڑا تھا۔ اور وہ قہر بار نظروں سے دیکھتا بڑبڑاتا چلا گیا۔

''میرے آرڈر کی پوزیشن کیا ہے مسٹر فوزان؟ آپ مستقل پندرہ دن سے مجھے ٹال رہے ہیں، اندازہ نہیں ہے شاید آپ کو کہ اگر میرے ٹائم فریم میں گڑبڑ کی تو کیا نتائج ہونگے۔''

موبائل سے ابھرنے والی نسوانی آواز میں تحکم کے ساتھ درشتگی بھی تھی۔ فوزان جو چند لمحے پیشتر کاریگر کے یکایک چلے جانے سے دباؤ میں تھا، کرنل صاحب کی بیٹی کا فون سن کر مزید تناؤ محسوس کرنے لگا۔ وہ اس دن کو پچھتا رہا تھا جب اس نے یہ آرڈر ہاتھ میں لیا تھا۔

''مجھے کیا پتہ تھا یہ کمینے بیچ چوراہے پہ مروائیں گے، سالے ہر دوسرے روز چھٹی کر جاتے ہیں، کام وقت پر کیسے پورا ہوگا، سارا عتاب اس کرنل کی بچی کا مجھ پر ہے، اس کو کون بتائے کہ اصل وجہ کیا ہے۔''

فوزان نے اپنے کارخانے میں کام کرنے والوں پر ایک بیزار نگاہ ڈالی اور ڈھیلے قدموں سے چلتا باہر آ گیا۔

بالآخر گزشتہ رات اس نے روٹھے کاریگر سے رابطہ کیا، ساری انا اور خودی بلائے طاق رکھتے ہوئے ہر طرح سے اس کی خوشامد کرتے ہوئے اسے راضی کرلیا کہ وہ کرنل کی بیٹی کا آرڈر پورا کرانے میں تعاون کرے۔رات گزرتے ہی صبح اس کا فون آیا کہ اماں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اسکو ہسپتال لے جانا ہے پانچ ہزار کا بندوبست کردیں۔

فوزان نے اس کا فون سن کر ہاتھ میں پکڑا اخبار تقریباً پٹختے ہوئے زیرلب اسے چار سنائیں اور والٹ دیکھنے لگا۔ صبح کے سات بج رہے تھے، مطلوبہ رقم نکالتے ہوئے وہ سخت کوفت کا شکار تھا۔اسے خوب اندازہ تھا کہ یہ آدمی اس کی کمزوری جان کر اپنی من مانی کررہا ہے۔ابھی پچھلے ماہ ہی اتنی رقم وہ قرضے کے نام پر لے چکا تھا، جوادا کرنا باقی تھی، اس طرح دوسرے ملازمین کو بھی شہہ مل رہی تھی، وہ بھی ہر دوسرے دن اپنی ضرورتیں اتنی دکھی شکل بنا کر بیان کرتے تھے کہ فوزان کو بے اختیار حضرت سلیمانؑ کا قصہ یادآ جاتا جب انہوں نے دنیا کی تمام مخلوق کوایک دن دعوت کھلانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن مہینوں کی جناتی تیاریوں کے باوجود بھی وہ ناکام رہے تھے اور ایک وہیل مچھلی آ کر تمام غذا ہڑپ کرگئی تھی اور اس پر مزید کھانے کا مطالبہ کررہی تھی اس نے کہا تھا ''اے سلیمانؑ! یہ تو میرا ایک لقمہ ہے، میرا رب تو روز ایسے کئی لقمے مجھے کھلاتا ہے اور سلیمانؑ کو ایمان کامل ہوگیا تھا کہ ربِ واحد کی ذات کے سوا کوئی اس کی مخلوق کی غذا ایک دن کے لئے بھی مہیا نہیں کرسکتا۔

فوزان دل میں التجا کرتا ''یااللہ! میں تو تیرے ایک بندے کی کامل ضرورتیں ...... چاہے وہ مادی ہی ہوں...... پوری کرنے سے قاصر ہوں اور یہاں تو ہر وقت میرے سر پر کوئی نہ کوئی سوالی بن کرآ جاتا ہے۔''

فوزان بمشکل اپنے موڈ کو ہموار رکھتے ہوئے ان سے اپنا عذر ظاہر کردیتا لیکن یہ سلسلہ چل ہی پڑا تھا۔ پہلے چار پانچ ماہ میں دوتین بار یہ صورتحال پیش آئی مگر اب تو آئے دن یہ ہونے لگا تھا۔ اس پر کام چھوڑنے کی دھمکی، ان ملازمین کا مؤثر ہتھیار تھی ۔ فوزان سوچتا میری ماں کو تو ایسی گھمبیر صورتحال سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا، نہ جانے کونسے وظیفہ سے وہ ان خبیثوں کو قابو کرتی تھیں۔

حقیقتاً امینہ نے زندگی کے اہم ترین فیصلے محض اپنی پسند اور مفاد کو بنیاد بنا کر نہ کیے تھے۔حتی الامکان رب

کی رضا کو مقدم رکھا تھا تو اسی رب نے اپنی فرمانبرداری کے بدلے اپنی مخلوق ان کے تابع کر دی تھی۔

فوزان بہن کی ملامتی نظروں سے نظریں چراتا ہوا بیٹی کو اسکول اسی لباس میں لے گیا تھا جو دنیا کے اخلاقی معیار میں نامناسب تو نہ تھا لیکن ایک مومن کی اولاد کو زیب نہ دیتا تھا، وہ معصوم اور بھولی بھالی روح جو ابھی کم عمری کی بنا پر پراگندہ نہ ہوئی تھی، اس کو ایسے ہی بظاہر بے ضرر نظر آنے والے رجحانات، پہلے خیالات اور پھر راہوں کی آلودگی تک لے جاسکتے تھے۔

امینہ کی نظریں یہ سب دیکھ رہی تھیں، اور بھانپ بھی رہی تھیں، لیکن کلی طور پر اس کا تدارک وہ کر نہ پاتی تھیں۔ حمنہ نے کچھ تبدیلیاں گھر کے ماحول میں تلخی گھلنے سے بچانے کے لئے اپنی ذات کی حد تک بادلِ ناخواستہ اپنا لی تھیں لیکن اپنی اولاد کو وہ جس طرح صحیح سمجھتی تھی اس طرح پال رہی تھی۔ اولاد کے لئے فوزان میں وہ دم خم وقت کے ساتھ رہا بھی نہیں تھا۔ ماسوائے ایک آدھ فیصلے کے تقریباً تمام اختیارات اولاد کے حمنہ ہی کے پاس تھے، وہ اپنے کام کے مسائل میں اس قدر الجھا رہتا تھا، اور جب الجھا نہ رہتا تو محو رہتا کہ یاد ہی نہیں رہتا کہ ایک باپ کے لئے اولاد کی تربیت بہترین تحفہ ہے۔

یہ درست ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ انسان کیلئے بڑھتا ہوا معاشی دباؤ اسکی توجہ خیر کی جانب بڑھنے سے روک رہا ہے۔ شر کے خلاف مزاحمت بتدریج کم ہو رہی ہے۔ جدید ماحول کے تقاضے نبھانے کی راہ میں انسان یا تو غیر متوازن بااختیار بن رہا ہے یا پھر کلی طور پر بے اختیار۔

فوزان نے اس کشمکش بھرے راستے میں قدم جمانے کے لئے ان پابندیوں سے بھی صرف نظر کیا۔ جن پر امینہ کے برانڈ The artist کی بنیادیں اٹھائی گئی تھیں۔ بہت کم عرصے میں اس نے مادی فراوانی کا گراف بڑھا دیا تھا۔ شہر کے صاف ستھرے مہنگے ترین علاقے میں وِلا خریدنے کیلئے حمنہ کا اصرار بڑھنے لگا تھا جبکہ امینہ خرچوں کو ایک حد میں رکھنے کی قائل تھیں، درودیوار کی تزئین وآرائش کے بھاری اخراجات کتنے ہی بے بس اور منتظر نگاہوں کے لئے راحت بن سکتے ہیں اور کتنی ہی آنکھوں میں حسد اور جلن بھی پیدا کرتے ہیں۔

''میرا خیال ہے فوزان کہ ہم ایک درمیانی راہ پر چلتے ہیں، تم بجائے گراں ترین رہائش گاہ خریدنے کے

اپنے بزنس کو بڑھانے کا سوچو۔'' امینہ نے اپنی ناپسندیدگی کو اس کے مفاد تلے رکھ کر ظاہر کیا۔

پاس بیٹھی حمنہ کی آنکھیں یہ سن کر کسی خیال کے تحت چمک اٹھیں۔

''ٹھیک ہے تو پھر بجائے ادھر گھر خریدنے کے ہم اپنی برانچ کھول لیتے ہیں۔ گھر ہم یہاں سے کچھ دور پل کے اس پار والی کالونی میں لیتے ہیں فی الحال۔'' فی الحال کو جما کر کہتے ہوئے حمنہ نے پر جوش ہو کر میاں اور ساس کو باری باری دیکھا۔

''اس برانچ کو سنبھالے گا کون؟'' امینہ نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور بیٹے کی طرف دیکھا، وہ جانتی تھیں بیک وقت دو مختلف جگہوں کا کام ایک آدمی نہیں سنبھال سکتا۔

''میرا خیال ہے کہ حمنہ بخوبی کام کر لے گی۔''

میاں کے جواب سے حمنہ مطمئن جبکہ امینہ مضطرب سی نظر آ رہی تھیں۔ فکر ان کو بچوں کی تھی کہ بڑھتی عمر کے بچوں کو قدم بہ قدم نگرانی کرتی محبت بھری نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ناگزیر وجوہات کے علاوہ ''خود اعتمادی'' دینے کے نام پر والدین کو ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے ان کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نشوا بارہ سال کی ہونے والی تھی۔ بیٹے بھی بلا کے شرارتی اور ذہین تھے۔ ایک ماں کے پاس سات آٹھ گھنٹے باہر گزار کر اتنی توانائی نہیں بچتی کہ وہ انسانوں کو تیار کرنے والے کارخانے کو بھی اپنا عمدہ وقت دے سکے۔ جو بچی کھچی وقت کی کھرچن، ''کوالٹی ٹائم'' کے نام پر اولاد کو ملتی ہے وہ حق ادا ہی نہیں کر پاتی۔

لیکن بہر حال امینہ نے اس طرح نہ روکنا چاہا تھا جیسا ہوا، اس طرح کہ پورا گھر ہی سہم کر رہ گیا۔ زندگی کی آغوش میں پلنے والے انسانی شیاطین سے واسطہ پڑ جائے تو آدمی بے اختیار رب کی طرف پلٹتا ہے۔ نہیں پلٹتا تو اپنے اوپر ان سے زیادہ خود ظلم کرتا ہے۔

وہ ایک پرسکون رات تھی۔ امینہ سب مصروفیات سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری میں تھیں کہ نامانوس سی آہٹوں سے چونک گئیں۔ اس کے بعد سوچنے کا وقت نہ ملا اور پورے گھر کو پتہ چل گیا کہ وہ جو آج تک خبریں پڑھتے تھے خود ہی ایسی ہی ایک خبر کا حصہ بننے والے ہیں۔ آنے والے خوش پوش جوان بڑے ہی مطمئن انداز میں سب کچھ ایسے سمیٹتے رہے جیسے انہیں رتی برابر بھی گھبراہٹ نہ ہو۔ وہ زیور جو حمنہ نے حال ہی میں بینک کے لاکر سے نکلوایا تھا۔ وہ طلائی چوڑیاں جو

فوزان نے ماں کے لئے خریدیں تھیں، وہ کرنسی جو محض ایک رات کے لئے گھر پر تھی کہ اگلی صبح بزنس کے لئے نئی جگہ کی ادائیگی کا کچھ فیصد نقد ادا کرنا تھا۔ اور بھی بہت کچھ ایسے چلا گیا گویا کبھی ان کا نصیب ہی نہیں تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جیسے وہ متاع ملی ہی ان ڈاکوؤں کے لئے تھی جو وہ بآسانی لے گئے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

میری لائبریری سے

قبر، نزع، موت کے متعلق کچھ واقعات صحابہ کرامؓ کی زندگی سے اور کچھ سلف صالحین کے بہت ایمان افروز ہیں۔ موت کی ہمہ وقت تیاری کرنے والوں کی شان اور جنت جہنم کا تذکرہ بھی کتاب میں موجود ہے۔

ام المومنین حضرت ام سلمیٰؓ کے جنت کے متعلق سوالات اور محبوبِ خدا کے جوابات ملاحظہ ہوں۔

میں نے کہا یارسولؐ اللہ حور عین کی خبر دیجیے۔

آپؐ نے فرمایا وہ گورے رنگ کی ہیں بڑی بڑی آنکھوں والی کالے سیاہ اور بڑے بڑے بالوں والی جیسے گدھ کا پر۔

میں نے کہا اور لُولُو المکنون کیا ہے؟

فرمایا ان کی صفائی اور جوت (چمک) مثل اس موتی کے ہے جو ابھی ابھی سیپ سے نکلا ہو جسے کسی نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔

میں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ خیراتٌ حسان کی کیا تفسیر ہے؟

فرمایا: خوش خلق اور خوب صورت۔

میں نے کہا بیضٌ مکنون سے کیا مراد ہے؟

فرمایا: ان کی نرمی اور نزاکت انڈے کی اس جھلی کی مانند ہوگی جو اندر ہوتی ہے۔

میں نے عُرُباً اترابا کے معنی دریافت کیے۔

آپؐ نے فرمایا: اس سے مراد دنیا کی مسلمان جنتی عورتیں ہیں جو بالکل بوڑھیا اور پھونس تھیں اللہ نے انہیں نئے سرے سے پیدا کیا اور کنواریاں خاوندوں کی چہیتیاں اور خاوندوں سے عشق رکھنے والی ہم عمر بنادیا۔

میں نے پوچھا یارسولؐ اللہ دنیا کی عورتیں افضل ہیں یا حورعین؟

فرمایا: دنیا کی عورتیں حورعین سے بہت افضل ہیں جیسے استر سے ابرا بہتر ہوتا ہے۔

میں نے اس فضیلت کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا: نمازیں روزے اور ان کی عبادتیں۔ اللہ نے ان کے چہرے نور سے ان کے جسم ریشم سے سنوار دیئے۔ سفید ریشم اور سبز ریشم، زرد سنہرے ریشم، زرد سنہرے زیور، بخوردان موتی کے، کنگھیاں سونے کی یہ کہتی رہیں

گی۔

نحن خالداتُ فلاتموت ابدا

ونحن النا عمات فلا بنا س ابدا

یعنی ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں کبھی مریں گی نہیں ہم نازونعمت والیاں ہیں۔

قارئین کتاب میں کئی واقعات اوراحادیث ایسی ہی درج ہیں جن کو پڑھ کر پڑھنے والا رک کر اپنا محاسبہ کرتا ہے۔(اورحقیقت یہی ہے کہ اپنی موت کی یاداور اپنا محاسبہ،ہی آخرت میں کام آئے گا)

کتاب میں شیخ سعدیؒ کا ایک تاجر سے ملاقات کا واقعہ تحریر ہے جو اپنی تجارت کے قصے سنا رہا تھا۔فلاں جگہ میرا اس چیز کا کاروبار ہے، فلاں جگہ فلاں چیز کا۔ سارے قصے سنانے کے بعد بولا میری تمام آرزوئیں تو پوری ہوگئیں۔میری تجارت پروان چڑھ گئی اب مجھے آخری سفر تجارت پر جانا ہے۔ آپ دعا کریں وہ کامیاب ہوجائے اس کے بعد میں قناعت کی زندگی اختیار کروں گا اور اپنی دکان پر بیٹھ جاؤں گا۔

شیخ سعدیؒ نے آخری سفر کا پوچھا تو کہنے لگا یہاں سے سامان خرید کر چین جاؤں گا پھر چین سے شیشہ خرید کر روم فروخت کروں گا کہ وہاں چینی شیشے کے دام بہت اچھے ملتے ہیں۔پھر روم سے سامان لے کر سکندریہ جاؤں گا۔اسکندریہ میں سامان بیچ کر قالین خریدوں گا اور ہندوستان لاؤں گا ہندوستان سے حلب اور حلب سے......گویا اس نے پوری دنیا کے سفر کا پلان بیان کردیا کہ اس کے بعد میں قناعت کی زندگی بسر کروں گا۔شیخ سعدیؒ سب کچھ سننے کے بعد فارسی کے اشعار میں ماجرا بیان کرتے ہیں کہ تم نے عوز کے صحرا میں بہت بڑے سوداگر کا سامان اس کے خچر سے گرا دیکھا اس کا خچر بھی مرا پڑا تھا اور خود سوداگر بھی مرا ہوا تھا اور سامان اپنی زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو یا قناعت پر کرسکتی ہے یا قبر کی مٹی۔اس کی تنگ نگاہ کو کوئی اور چیز پُرنہیں کرسکتی۔''

قارئین! کتاب میں کچھ واقعات ان گناہگاروں کے بھی ہیں جن کو توبہ کی توفیق نہ ہوئی اور کتاب میں پھر توبہ کے موضوع پر مفصل بیان موجود ہے۔

ظالم عباسی خلیفہ واثق باللہ جس نے ظلم وبربریت کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی کی موت کے متعلق مولانا مناظراحسن گیلانی لکھتے ہیں کہ جب اس کی موت کا وقت تھا اورموت کی غشی اس پر طاری تھی کسی نے کہا شاید یہ ختم ہو چکا ہے اس کے قریب جانے کی ہمت نہ پڑتی

تھی آخر کار الذہبی آگے بڑھا اور سانس کا پتہ چلانے کے لئے ناک پر انگلی رکھی اچانک واثق نے آنکھیں کھول دیں۔ الذہبی پر دہشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی لیکن یہ اس کی آخری ہچکی تھی پھر وہ مرگیا اس کی لاش پر چادر ڈال دی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد محسوس ہوا کہ لاش کے اوپر دی چادر ہل رہی ہے چادر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک چوہا واثق باللہ کی آنکھیں نکالے بھاگے جاتا ہے۔

بے ساختہ اس کی زبان پر کلمہ جاری ہوگیا کہ یہی آنکھ تھی جس کے اٹھنے پر عوام میں دہشت طاری ہوجاتی تھی۔

قارئین! حدیث ہے میں تمہارے اندر مرشد چھوڑے جارہا ہوں جو تمہیں گمراہ نہیں ہونے دیں گے۔ پہلا مرشد ناطق۔ قرآن اور دوسرا مرشد (گونگا) ساکت، موت ہے۔ اس لیے کہ موت سے بڑا کوئی وعظ نہیں۔ دوسروں کو چارپائی پر مراد یکھنے سے دل کی کیفیت وہ نہیں ہوتی جو لمحہ بھر کے لئے اپنے آپ کو ''میت'' تصور کرکے چارپائی پر لیٹا دیکھنے سے......!! حضرت علیؓ نے فرمایا آخرت کے بنو دنیا کے نہ بنو کیونکہ آج دنیا میں عمل ہے حساب نہیں کل آخرت میں حساب ہوگا عمل نہیں۔''

قارئین! کتاب میں موت کو یاد رکھنے کے کئی سنہری نسخے بھی موجود ہیں۔ استقامت اور حسن خاتمہ کے لئے کئی طریقے درج ہیں مثلاً

ہر فرض نماز کے بعد الحاح (آہ وزاری) سے **ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا...... الوھاب** (آل عمران) کا پڑھنا سرکاری حکم (ربی) کے طور پر ثابت ہے۔

یا حیّ یا قیوم کا کثرت سے ورد کرنا۔ جب آپ ﷺ کو غم لاحق ہوتا تو کثرت سے پڑھتے تھے۔

مسواک کی سنت سے موت کے وقت کلمہ شہادت یاد آتا ہے۔

مسواک پکڑنے کا مسنون طریقہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ بیان کیا ہے۔ چھنگلیا (چھوٹی انگلی) کو مسواک کے نیچے رکھے اور انگوٹھا مسواک کے اوپری حصہ کے نیچے باقی انگلیاں مسواک کے اوپر۔

ہر روز حالت ایمان پر شکرانہ ادا کرنا۔ ایمان پر شکر ایمان کی بقا بلکہ ترقی کا ذریعہ ہے۔

بدنظری سے حفاظت پر حدیثِ مبارکہ کے مطابق ایمانِ کی حلاوت نصیب ہوتی ہے۔ اب ذرا رک کر

بدنظری کیوں اور کیسے کی فہرست آپ خود بنالیں۔ نامحرم، دکاندار، ملازم ،کولیگز،ٹی وی ڈراموں میں نامحرم...... وغیرہ وغیرہ۔ ملاعلی قاری فرماتے ہیں بدنظری سے حفاظت پر ایمان کی جوحلاوت نصیب ہوتی ہے وہ قلب سے کبھی نہیں نکلتی اس کا مطلب ہے مرتے دم تک موجود رہتی ہے۔

دعائے وسیلہ یعنی اذان کا جواب دینا جس کے متعلق احادیث میں ہے کہ آپؐ کی شفاعت واجب ہوگئی۔شفاعت اسی کی واجب ہوگی جس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اور مصنف لکھتا ہے شفاعت کسی کافر کی تو ہونہیں سکتی۔

استقامت اورحسن خاتمہ کے لئے دل پاکباز درکار ہے۔گندگیوں غلاظتوں سے لتھڑا دل نہیں اوراگر دل گندہ ہوتو توبہ ہی اسے پاک کرسکتی ہے۔مصنف کے خیال میں جہاں زہریلے پودے ہوتے ہیں وہیں پر تریاق موجود ہوتا ہے اسی طرح گناہ ہو بھی جائے تو توبہ کی نعمت مرتے دم تک موجود ہے۔

چونکہ حدیث میں ہے کہ جس نے گناہ سے توبہ کرلی وہ ایسا ہوگیا جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔تو وہ توبہ کیسی ہو کتاب میں پوری تفصیل موجود ہے۔کتاب میں توبہ بلکہ سچی توبہ کے بھی جابجا واقعات بکھرے ہوئے موجود ہیں۔ پھر کچھ ٹوٹکے بھی ہیں جو سارے کے سارے قابل عمل ہیں۔میں نے آج تک توبہ کے لوازمات پڑھے تھے لیکن عملی طور پر توبہ کیسے ہواس کا پہلے علم نہیں تھا۔مثلاً

۱۔اپنی نمازوں کا جائزہ درستگی کا اہتمام۔

۲۔زکوٰۃ کا کھاتا کھولیں اورازسرنو جائزہ لیں۔

۳۔روزے قضا تونہیں ہوتے اگر ہوتے ہیں تو قضا روزے رکھیں، دوسری صورت میں نفلی روزوں کا اہتمام کرلیں۔

۴۔حج نہیں کرسکے اور استطاعت ہے تو فوری بندوبست دوسری صورت میں کیے گئے حج کا جائزہ، ندامت،معافی تلافی۔

۵۔سجدہ تلاوت پورے کرتی آئی ہیں۔

۶۔مالی بقایاجات تونہیں ملازموں یا دیگر تعلق داروں کے ساتھ۔

۷۔وصیت نامہ لکھا ہوا موجود ہے۔(جو میں نے بڑے اہتمام سے لکھا اورداؤ میاں نے بارشوں کے موسم میں کشتی بنا کے بہادیا) مطلب یہ کہ کسی محفوظ جگہ پر رکھیں۔''بچوں کی پہنچ سے دور۔''زندگی کے بعد پہنچ

میں فوراً آ جائے ایسے نہ ہو مرنے کے بعد چار سال کے بعد وصیت نامہ ملے کہ فلاں کا یہ حساب کتاب ہے وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے آخر میں جہنم کا بھی بیان ہے۔ آخرت کی ساری منزلوں کو احادیث کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔

کتاب دوستی اصل میں موت کی تیاری ہی ہے۔ کتاب لیجیے کتاب پڑھیئے۔ کتاب پڑھایئے لیکن عمل کے باب میں کورے مت رہیے۔ دعاؤں کی طلب کے ساتھ اجازت۔

☆☆☆

بی بی قرسم خاتونؒ

آپ کا اصل نام بی بی مریم تھا اور قرسم خاتون کے نام سے معروف تھیں۔ آپ مولانا وجیہہ الدین جو ندی عباسیؒ کی صاحبزادی، شیخ جمال الدین سلیمان کی اہلیہ، شیوخِ عالم حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی والدہ ماجدہ تھیں۔

ان کے تین صاحبزادے تھے۔ اعزازلدین محمود، حضرت بابا فریدالدین مسعوداور نجیب الدین متوکل۔ آپ کے شوہر شیخ جمال الدین سلیمان کے آباواجداد کا سلسلۂ نسب بیس واسطوں سے حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔ آپ کے چوتھے دادا شیخ شہاب الدین فرخ شاہ کابلی کابل کے بادشاہ تھے۔ ان کی سلطنت کافی وسیع تھی لیکن غزنوی اقتدار کی وجہ سے آپ کی حکومت کابل تک محدود ہوگئی تھی۔ بعدازاں گردشِ زمانہ کے زیر اثر خلافتِ بغداد کے زوال کے بعد کردوں اور ترکوں کی پیدا کردہ طوائف الملو کی کے بعد آپ کے جدامجد شیخ محمد احمد کو لاہور ہجرت کرنا پڑی۔ پھر عازمِ قصور ہوئے۔ بادشاہِ وقت نے ملتان کے قریب کھوتوال کی جاگیر عطا کی اور علاقے کا قاضی مقرر کردیا۔

قرسم خاتون شب زندہ دار انتہائی عابدہ اور عارفہ کامل خاتون تھیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ ایک دفعہ رات کے وقت وہ عبادت میں مشغول تھیں کہ گھر میں چور گھس آیا۔ قدرتِ خداوندی سے چور اندھا ہوگیا۔ باہر نہ نکل سکا اور گھبرا کر بلند آواز سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی، چوری کرنے سے توبہ کی بینائی کیلئے التجا کی۔ آپ کو رحم آگیا، آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی اور چور کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ وہ وہاں سے چلا گیا صبح سویرے چور سر پر دودھ کا مٹکا اٹھائے بمعہ اہل وعیال آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر دولتِ اسلام سے مالا مال ہوا۔ اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا۔ اس نے قبول اسلام کے بعد کثرتِ مجاہدات وریاضت کی بدولت درجۂ ولایت حاصل کیا۔ اسے بی بی صاحبہ کے خاندان کی طرف سے چاولے مشائخ کا لقب حاصل ہوا۔ قصبہ کھوتوال اسی کے نام پر چاولے

مشائخ مشہور ہوگیا۔اس نے اپنی بقایا عمر اس خاندان کی خدمت میں گزاری۔

آپ کے دو بیٹوں فریدالدین مسعود اور نجیب الدین متوکل نے صوفیائے کرام میں خاص مقام حاصل کیا۔ بابا فرید گنج شکر بؒر کو چک پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کے موسس ثانی اور پنجاب میں موسس اول ہیں۔ وہ حضرت قطب الدین بختیار کا کی کے خلیفۂ اعظم تھے۔ 569ھ سے 584ھ کے درمیان کسی وقت قصبۂ کھوتوال میں پیدا ہوئے۔آپ کا اصل نام مسعود تھا۔فریدالدین آپ کا لقب ہے،عقیدت مند انہیں بابا فرید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔آپ کے والد آپ کی وفات کے چند سال بعد وفات پا گئے تھے۔آپ کی تعلیم وتربیت آپ کی والدہ ماجدہ قرسم خاتون نے کی۔

بابا فرید کو شیرینی سے خاص شغف تھا۔اسی شغف کی وجہ سے آپ کی والدہ روزانہ نمازِ فجر کے وقت آپ کے مصلّے کے نیچے شیرینی یا شکر کی پڑیا رکھ دیا کرتی تھیں۔آپ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ شکر نوش فرمالیا کرتے تھے۔ایک روز والدہ ماجدہ کو بسبب مشغولیت شکر رکھنی یاد نہ رہی۔ جب آپ شکر دینے کے لئے تشریف لائیں تو دیکھا بابا فرید شکر نوش فرما رہے ہیں۔ آپ سمجھ گئیں کہ اللہ تعالیٰ نے خزانۂ غیب سے یہ شکر عطا فرمائی ہے۔ اسی وقت بارگاہِ الٰہی میں اپنے پیارے بیٹے کے لئے دعا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تو شکر کی طرح شیریں ہوگا۔ یہ ان کی والدہ کی تربیت اور دعاؤں کا ثمر ہے کہ آپ کو وہ شان اور عظمت عطا ہوئی کہ آپ اقلیمِ روحانیت کے شہنشاہ بنے۔

آپ کی والدہ نے جملہ علوم کی تحصیل وتکمیل کیلئے ملتان بھیج دیا تا کہ وہاں کے اکابر علماء سے تعلیم حاصل کریں۔ آپ قطب الدین بختیار کا کیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے پھر مرشد کے کہنے پر طویل عرصے تک مختلف جگہوں کی سیاحت میں مشغول رہے۔ سیاحت کے دوران مختلف اکابر، اولیاء، علماء سے ملاقات کی ، ان سے کسبِ فیض کیا۔ سیاحت سے واپس آکر مرشد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے توانہوں نے خرقۂ خلافت عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ ھانسی جاکر اسلام کی تبلیغ واشاعت کرو۔ چنانچہ بابا صاحب ہانسی تشریف لے گئے۔مرشد کی وفات کے بعد دھلی پہنچے۔وہاں کچھ عرصہ قیام کیا پھر ھانسی چلے گئے۔ایک دن خواب یا مراقبے کی حالت میں مرشد کی طرف سے اجودھن پاک پتن میں مستقل قیام کرنے کا

اشارہ ہوا۔ چنانچہ وہ اجودھن تشریف لے آئے اور باقی ساری زندگی اسی قصبے میں گزاری۔ ان کی تبلیغی مساعی سے لاکھوں بندگانِ خدا کو ہدایت نصیب ہوئی اور اجودھن کی سرزمین رشکِ آسمان بن گئی۔

بابا فرید گنج شکر نے تمام زندگی قرآن اور سنت کی پیروی میں گزاری تمام عمر آقائے نامدار کی حیاتِ اقدس کو مشعل راہ بنایا۔ طبیعت میں بے حد سادگی اور انکسار تھا۔ ساری زندگی اختیاری فقروفاقہ میں گزاری۔ دنیا کی تمام نعمتیں میسر ہونے کے باوجود کیکر اور پیلو کے پھل کھا کر گزراوقات کی۔ آپ علوم باطنی کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ کا حلقہ ذکروفکر بڑے بڑے عالموں فاضلوں اور درویشوں کیلئے درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ تفسیر حدیث، علوم کلام اور تجدید قرآن کے بہت بڑے ماہر تھے۔ دقیق سے دقیق مسئلے چند ساعتوں میں حل فرما دیا کرتے تھے۔ آپ کے لنگر خانے کا دروازہ ہمہ وقت مساکین ومحتاج اور دور دراز سے آنے والے تمام خاص وعام کیلئے کھلا رہتا تھا۔ جو کچھ آتا فوراً درویشوں اور غریبوں میں تقسیم کردیتے۔ پاکیزگیٔ قلب کا یہ عالم تھا کہ آپ کا معدہ خالص رزق حلال کے سوا کچھ بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ایک بار حضرت محبوب الٰہی نے ایک آدمی سے قرض لے کر ڈیلے پکائے۔ یہ ڈیلے جب آپ کی خدمت میں پیش ہوئے تو آپ نے لقمہ منہ سے لگاتے ہی فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

بابا فریدالدینؒ نے تین شادیاں کیں آپ کی پہلی زوجہ بی بی خاتون سلطان غیاث الدین بلبن کی دختر تھیں۔ دوسری حضرت مجیب النساء خواہر محترم حضرت ذکریا سندھی اور تیسری شادی حضرت غوث الاعظم جیلانی کی بیوہ پوتی بی بی ام کلثوم سے کی۔ آپ کے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ آپ نے پچانوے سال عمر پائی۔

آپ کے مزار کے اندر ایک دروازہ ہے جسے بہشتی درازہ کہا جاتا ہے جس کے بارے میں بہت سی روایات مشہور ہیں کہ جو شخص پانچ محرم سے لے کر دس محرم تک اس دروازے کے نیچے سے گزرے گا اس کے تمام گناہ معاف ہوجائیں گے۔ لوگ اس معروف بات کے پیروکار بن کر اس کے گناہوں کی بخشش کیلئے ہر سال پانچ محرم کو پاکپتن جاتے ہیں اور اپنے طور پر گناہ معاف کرواکر آجاتے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر دروازے سے گزر کر

گناہوں کی معافی مل سکتی ہوتی تو ساری دنیا جرائم اور گناہوں کا اکھاڑا بن جاتی۔کوئی شخص نیک کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔حقیقت تو صرف یہی ہے کہ ہر شخص نے اپنے نیک اعمال کی بدولت ہی جنت میں جانا ہے۔ بہشتی دروازے سے عقیدت رکھنے والوں کو قرآن پاک پڑھ کر خود فیصلہ کرنا چاہیے۔گناہوں کی معافی اگر کسی دروازے سے گزر کر مل سکتی ہے تو وہ ''توبہ کا دروازہ'' ہے نہ کہ بہشتی دروازہ۔

بابا فرید گنج شکر کی پنجابی شاعری دنیا کی حقیقتوں اور بنی نوع انسان کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔اللہ کے احکامات کو شاعری میں ڈھال کر بہت اعلیٰ وارفع پیغام دیتی دکھائی دیتی ہے۔

ے پنج رکن اسلام دے تے چھیواں
فریدا ٹُک
جے نہ لبھے چھیواں تے پنجے ای
جاندے مُک

اسلام کے پانچ رکن ہیں لیکن اے فرید!ایک چھٹا رکن بھی ہے اور وہ ہے روٹی......اگر یہ چھٹا نہ ملے تو باقی پانچوں بھی جاتے رہتے ہیں۔

ے رکھی سکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی
ویکھ پرائی چوپڑی نہ ترساویں
جی

اپنے پاس جو ہے اس پر صبر شکر کرنا چاہیے(ٹھنڈا پانی صبر کی علامت ہے)دوسروں کے پاس مال ودولت کی فراوانی دیکھ کر اپنا دل پریشان نہیں کرنا چاہیے۔

ے چڑھ فریدا کوٹھے تے، ویکھ گھر گھر لگی
اگ
توں سمجھیں میں دکھی آں ایتھے دکھی
سارا جگ

اے فرید!اگر تم دنیا کے لوگوں کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا ہر گھر میں مشکلات اور پریشانیاں ہیں۔تم سمجھتے ہو کہ صرف تم ہی دنیا میں سب سے زیادہ دکھی ہو۔دنیا کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوگا کہ ساری دنیا ہی دکھی اور غم زدہ ہے۔

بی بی قرسم خاتون کے دوسرے صوفی بیٹے شیخ نجیب الدین متوکل تھے۔وہ اپنے بھائی فریدالدین کے مرید تھے۔اور انہی سے ہی خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ خرقۂ خلافت پانے کے بعد مرشد کے حکم سے دہلی جا کر قیام پذیر ہوگئے اور مخلوق خدا کی اصلاح اور ہدایت میں

مشغول ہوگئے۔کبھی کبھی باباصاحب کی زیارت کیلئے پاک پتن بھی چلے جاتے۔ عبادت و ریاضت میں انہماک حاصل تھا۔ اکثر ایک بند حجرے میں یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ جلد ہی ان کے کمالات کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور مخلوق خدا کسب فیض کیلئے ان کے آستانے پر ٹوٹ پڑی۔ زھد وقناعت کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی دن گھر میں چولھا نہ جلتا تھا۔ محض پانی پی کر گزارا کر لیتے۔ انہوں نے دھلی میں ہی وفات پائی اور وہی ان کی آخری آرام گاہ بنی۔

جب بابا فرید نے اجودھن پاک پتن میں توطّن اختیار کیا تو کچھ عرصے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو وہاں سے کھوتوال بھیجا کہ والدہ ماجدہ کو اجودھن لے آئیں۔ وہ کھوتوال پہنچے اور بی بی صاحبہ کو اجودھن جانے پر رضامند کرلیا۔ چنانچہ انہوں نےضّعیف العمر والدہ کو گھوڑی پر بٹھایا اور خو د پا پیادہ اجودھن کی طرف روانہ ہوئے۔ کھوتوال اورا جودھن کے راستے میں ایک مہیب جنگل تھا جس میں شیر چیتے اور دوسرے خونخوار جانور بکثرت تھے۔ جب شیخ نجیب الدین اس جنگل کو عبور کر رہے تھے کہ والدہ محترمہ کو سخت پیاس لگی۔ شیخ نے انہیں ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا اور خود پانی کی تلاش میں نکلے بہت دیر کے بعد پانی لے کر واپس آئے تو درخت کے نیچے کچھ بھی نہ تھا۔ دیوانہ وار والدہ کو آوازیں دینے لگے لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پریشان ہوکر ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگے، آخر مایوس واپس لوٹے۔ بہت مغموم ومخزون تھے۔ باباصاحب کی خدمت میں اجودھن پہنچے اور سارا ماجرا آپ کو سنایا۔ انہوں نے چند آدمی شیخ نجیب الدینؒ کے ساتھ والدہ کی تلاش کیلئے جنگل میں بھیجے لیکن وہ بھی مایوس واپس لوٹ آئے۔
اب باباصاحب رضائے الٰہی پر شاکر ہوگئے اور فرمایا:

''مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور فقراء کو صدقہ کرو۔''

یہ واقعہ 643ھ کا ہے۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ اس سانحے کے بعد شیخ نجیب الدینؒ پھر اس جنگل میں گئے تو ان کو ایک جگہ کچھ انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملیں۔ یہ جگہ اس درخت کے نواح میں تھی جہاں والدہ کو بٹھا کر گئے تھے۔ ان کو یقین ہوگیا کہ کسی درندے نے والدہ کو شہید کر دیا ہے اور یہ ہڈیاں انہی کی ہیں چنانچہ انہوں نے ساری ہڈیاں جمع کر کے اپنے خریطے میں ڈال لیں اور باباصاحب کی خدمت میں پہنچ کر ان ہڈیوں کا ذکر کیا، انہوں نے

کہا ''یہ ہڈیاں مرے مصلّے پر ڈال دو۔''

شیخ مجیب نے خریطہ کھولا تو اس میں سے کوئی ہڈی برآمد نہ ہوئی حالانکہ اس سارے عرصے میں انہوں نے حریطے کو بحفاظت تمام رکھا تھا۔ سب نے اسکو اللہ تعالیٰ کا بھید سمجھا اور شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کیا۔

(نوٹ: اس مضمون کی تیاری کیلئے چار سو باکمال خواتین از طالب ہاشمی اور انٹرنیٹ سے استفادہ کیا گیا)

ماہ فروری میں شائع ہونے والے مضمون ''نور جہاں'' میں مفید معلومات کیلئے سمیہ مسعود عبدہٗ کی شکرگزار ہوں۔

☆☆☆

ثناءعلیم

ذرا دیوسائی تک

کراچی کی ہڑتالوں سے لے کر دیوسائی کی بلندیوں تک، پاکستان کے ایک کونے سے
دوسرے کونے تک کا زمینی سفر جو پیارے وطن کے کتنے ہی رنگوں کی جھلک دکھا جاتا ہے

زندگی ایک سفر کا نام ہے۔ گزرتے لمحوں، بیتتے سالوں، ڈھلتی عمروں کے ساتھ ساتھ اس کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ بہت سارے وہ کام جن کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کر لیتے ہیں۔ سفر، بیماریاں، آزمائشیں، خوشیاں اور غم جھیل لیتے ہیں۔ اگر صرف ایسا ہو کہ سب کچھ انسان کی مرضی کے مطابق ہو تو زندگی ایک ہی ادا سے چلتی رہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ زندگی کا مزہ ہی تبدیلی میں ہے۔

انسان تبدیلی چاہتا ہے۔ گھر کی سیٹنگ بدل کر، صوفے اور میز کی ترتیب بدل کر، فیشن تبدیل کر کے، نئے کپڑے پہن کر خوش ہوتا ہے۔ موسموں کی تبدیلی، پھلوں اور سبزیوں کا بدلہ ہوا ذائقہ خوشیوں کا پیغام لاتا ہے۔ گرمیاں موسم کی سختی کے ساتھ ساتھ چھٹیوں کا تحفہ لاتی ہیں۔ سال بھر کے تھکا دینے والے روٹین کے دل بعد چاہتا ہے کہ آرام اور سکون کیلئے کہیں دور چلے جائیں۔ شہر کی رونقوں سے دور خاموش فضاؤں میں دن گزارتے جائیں۔

اس سال ہم نے بھی ان تعطیلات میں بہت دور کی سوچی اور کچھ نیا ایڈونچر کرنے کی ٹھانی جو عموماً لوگ نہیں کرتے ہوں۔ مری، اسلام آباد، کاغان، ناران تو سب ہی جاتے ہیں تو اس دفعہ اسکردو جایا جائے وہ بھی اپنی گاڑی میں۔

رمضان المبارک کی آمد آمد تھی اس لئے جلد از جلد روانہ ہونا تھا۔ جون کی 22 تاریخ مقرر ہوئی۔ تین، چار دن میں جلدی جلدی تیاری کی۔ سفر کا سوچ کر مجھے کچھ ہونے لگتا ہے مگر صاحب نے تیاری کے لئے اتنا مختصر وقت دیا کہ زیادہ ڈپریشن میں جانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ قارئین کرام! آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ میں بالکل بھی ایڈونچرس نہیں ہوں۔ مجھے تو گھر سے باہر نکلنا، ملنا ملانا ہی بہت مشکل لگتا ہے مگر اکثر انسان کا سابقہ اپنے مزاج کے برعکس حالات سے ہوتا ہے۔

خیر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہمارے سفر کا دن

آ گیا۔ جمعہ 21 جون کراچی کے حالات خراب حسب معمول خراب ہوگئے۔ دوپہر کے بعد دکانیں بند ہوگئیں اور بذریعہ سڑک سفر کیلئے جو چیزیں درکار تھیں وہ ہم نہ لے سکے۔ ہفتہ کی صبح 4 بجے نکلنا تھا۔ شہر مکمل خاموش تھا۔ چند ایک بھولی بسری گاڑیوں کے سوا شہر میں مکمل سناٹا اور سکوت کی کیفیت تھی۔ تمام پیٹرول پمپس بند تھے البتہ سہراب گوٹھ پہ رونق تھی اور اندرون ملک جانے والی گاڑیاں مسافروں کے انتظار میں تھیں۔ ہم نے سپر ہائی وے سے پیٹرول بھروایا۔ ایک دن پہلے حکومت نے پیٹرول کے نرخ کم کئے تھے مگر پیٹرول ہمیں مہنگا ہی ملا۔ اندھی کمائی تھی جو ہم نے سارے سفر بھگتی۔ Daewoo کے اسٹیشن پر رک کر بسکٹ، چپس، اسنیکس وغیرہ خریدے اور عازم سفر ہوگئے۔

2 گھنٹے بعد ہم حیدر آباد پہنچے۔ Navigator نے حیدر آباد بائی پاس کے بجائے اندرون شہر سیر کرادی۔ یہاں بھی ہڑتال کا سماں تھا مگر کراچی سے کم۔ چند دکانیں کھلی تھیں مگر سڑکوں پہ معمول سے کم رونق تھی۔ ہائی وے کے ساتھ ساتھ آموں کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ گاڑی روک کر آموں سے لطف اندوز ہوں مگر سفر طویل ہونے کی وجہ سے نہ رکنے میں بہتری تھی۔ بچے راستے سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر ہمیں اس بات کی جلدی تھی کہ جلد از جلد روشنی میں سندھ کی حدود پار کر لی جائیں۔ لوگوں نے ڈرایا جو تھا کہ ڈاکو لوٹ لیتے ہیں، کہیں نہ رکنا وغیرہ وغیرہ۔

سکھر کے راستے میں کھجور اور آم کے بیشمار باغات ہیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر باغات سماں باندھ دیتے ہیں۔ نخلستان سے گزرتے ہوئے روہڑی کے پہاڑ آجاتے ہیں۔ میں ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ یہ روہڑی کہاں سے آتی ہوگی۔ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر پتھر گاڑیوں میں لوڈ ہو رہا تھا۔ مزید آگے، پنو عاقل، گھوٹکی اور بے شمار چھوٹے بڑے شہر آتے چلے گئے۔ ڈہرکی کے قریب اینگرو کی بہت بڑی فیکٹری دیکھی۔ اندر پوری کالونی آباد ہے۔ اس فیکٹری کی وجہ سے ڈہرکی شہر نسبتاً develop دکھائی دیا۔

کھیتوں کھلیانوں سے گزرتے ہوئے شام 5 بجے ہم پنجاب کی حدود میں داخل ہوگئے۔ اب سڑک پر لگے ہوئے ایک پارٹی کے سائن بورڈ کی جگہ دوسری پارٹی کے سائن بورڈ نے لے لی۔ سندھ کی ٹوٹی پھوٹی سڑک کے بعد پنجاب میں گاڑی تیزی سے بھاگنے لگی۔ سبک رفتار سڑک اور ہریالی، ڈھلتا سورج سب

کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہماری پہلی منزل بہاولپور تھی۔ جہاں ہم رات 9 بجے کے قریب پہنچے۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ڈر بھی لگ رہا تھا۔ ہمارا گیسٹ ہاؤس پہلے سے بک تھا۔ ''المائدہ ریسٹورنٹ'' میں کھایا۔ بہاولپور شہر سکولوں اور کالجوں کا شہر ہے۔ یہاں کی پہچان صادق پبلک سکول ہے، جو شہر کے وسیع و عریض رقبے پر قائم ہے۔ نور محل، بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال، ہائی کورٹ، میوزیم، بڑی عمارات ہیں جو انگریزون کے زمانے کی تعمیرات ہیں۔

اگلی صبح لاہور کیلئے روانہ ہوئے نیشنل ہائی N5 ملتان، ساہیوال، اوکاڑہ اور جنوبی پنجاب کے ہرے بھرے شہروں میں گھماتی رہی۔ چیچہ وطنی کے جنگلات اور رینالہ خورد میں مچلز کمپنی کے فارمز نظر آئے۔ ہڑپہ شہر سے بھی گزرے اور تقریباً 4 بجے لاہور پہنچے۔ شہر میں سخت گرمی تھی۔ جس جگہ ہم ٹھہرے وہ گھر رائیونڈ روڈ پر وزیر اعظم کی گزرگاہ پر واقع ہے۔ چوڑی چوڑی سڑکیں اور قرینے سے لگے سائن بورڈ، بہت ہی خوبصورت، طریقے سے لگائے گئے پودے اور درخت شہر کی ترقی کا پتہ دے رہے تھے۔ قریب ہی شوکت خانم ہسپتال ہے۔ کینال بینک روڈ اور انڈر پاسز سے گزرنا بہت اچھا لگا۔ لاہور میوزیم کی سیر کی۔ عجائب گھر مین عجب دستور دیکھا کہ داخلی دروازے پر موبائل فون تو جمع کروانے تھے مگر کیمرہ لے جانے کی اجازت تھی۔ عجائب گھر کی دنیا ہی اور تھی۔ جس طرح شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، شالیمار باغ مغل بادشاہوں کی کہانی سناتے ہیں اس طرح ان کے زیر استعمال رہنے والی چیزوں کا مشاہدہ تھی دلچسپ بھی تھا اور عبرت کا سامان بھی لیے ہوئے تھا۔ مختلف بادشاہوں کے زیر اہتمام رہنے والی کرسیاں، قالین، چغے، زیورات، کھانے پینے کے برتن، آرائشی اشیاء، سکے اور بے شمار چیزیں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ

؎ جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جاہے تماشا نہیں ہے

تحریک پاکستان سے متعلق دستاویزات، نایاب تصاویر، پرانے نوٹ بہت کچھ میوزیم میں محفوظ ہے مگر یہ احساس ہوا کہ یہ میوزیم اتنا محفوظ نہیں ہے جتنا ہونا چاہیے۔ چیزوں پہ جمی دھول مٹی، رنگ وروغن کا نہ ہونا، سخت گرمی میں AC کی کمی حکومت پنجاب کی نظر التفات کی منتظر ہے۔ اگر آپ شوقین ہیں اور چیزوں کو گہرائی سے دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو لگ بھگ آدھا دن

لاہور میوزیم کو دیکھنے کے لئے درکار ہوگا مگر شدید گرمی کی وجہ سے ہم نے میوزیم میں بمشکل 2 گھنٹے گزارے۔

اونچی اونچی عمارات، شاپنگ سنٹرز، بے شمار بیکریاں، خوبصورت بالائی اور زیریں گزر گاہیں......شہر کی خاص بات یہاں کے لال اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات ہیں اوراہم بات یہ کہ لاہور شہر میں کراچی کی طرح فلیٹوں کی برسات نہیں ہے۔ کراچی میں بلڈرز نے جس طرح کچے پکے فلیٹس بنا کر شہر کو بدصورت بنایا ہے ابھی تک لاہور اس سے بچا ہوا ہے یہ الگ بات ہے کہ پرانے شہر کے اپنے مسائل ہیں جو وہاں کے باسی ہی زیادہ بہتر جانتے ہونگے۔ ہاں! ہر گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ لاہور کیا پنجاب کا ہر شہر بجلی سے محروم ہے۔ ہم چونکہ لاہور اس سے پہلے گھوم چکے تھے اس لئے زیادہ گھومنے کے بجائے آرام کرنے کو ترجیح دی۔ ذہن میں یہ تھا کہ گھومیں گے تو صرف اسکردو جا کر یہاں تو صرف ٹھہرنا ہے۔ ہمارے میزبانوں نے خوب خاطر مدارات کیں۔

خبروں میں جب یہ سنا کہ نانگا پربت دیامر میں 10 غیر ملکی کوہ پیماؤں کو ماردیا گیا ہے تو ہمیں اپنا پلان ٹوٹتا ہوا نظر آنے لگا۔ اب کیا کریں؟؟؟ ایک دن سوچ بچار کے بعد آخر کار عقل کو چھوڑ کر دل کا کہا مان لیا اور موٹروے کے راستے کلر کہار، حسن ابدال، ایبٹ آباد، مانسہرہ سے ہوتے ہوئے شاہراہ قراقرم پر بشام کی طرف عازم سفر ہوئے۔ بٹگرام سے تھاکوٹ برج تک سڑک بہت چوڑی اوراچھی ہے جو چینی انجینئر کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ صبح 5 بجے کے چلے ہوئے شام 4 بجے کے قریب ہم بشام شہر پہنچے۔ تھاکوٹ برج سے انٹری کا سلسلہ شروع ہوا جو اسکردو تک ہمارے ساتھ رہا۔ بیسیوں جگہ شناختی کارڈ دکھا کر اپنا اندراج کروایا۔ تھاکوٹ چیک پوسٹ پر جب سپاہی کو بتایا کہ ہم اسکردو جارہے ہیں تو اس نے کہا:

''حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آگے بسوں سے تار کر ماردیتے ہیں۔''

ہم نے پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آگے کی راہ لی۔ آگے ایک فوجی نے مشورہ دیا کہ فیملی کے ساتھ آئے ہو کانوائے کے ساتھ چلے جانا پھر باہمی مشورے سے طے پایا کہ جس ارادے سے نکلے ہیں اسے پورا کیا جائے ورنہ باتیں سنتے رہے تو بس...... جو ڈر گیا وہ مر گیا۔

عزم و ہمت کا کوہ گراں بن کر نہایت خوبصورت بشام شہر میں داخل ہوگئے۔ دریائے سندھ کی رنگ رلیاں سرسبز وادیاں، NATCO کی بسیں، خوبصورت بچے صوبہ خیبر پختونخواہ میں داخل ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔ شہر کے آغاز ہی میں PTDC ہوٹل ہیں۔ حکومتوں کے اچھے وقتوں کے بنائے گئے یہ ہوٹل ہر سیاحتی مقام کے انتہائی خوبصورت نظاروں پر واقع ہیں۔ ہر طرح کی سہولیات کے ساتھ ساتھ قدرتی حسن سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ بشام PTDC کے دروازے پر بینر لگا ہوا تھا کہ ایک سال سے ملازمین کی تنخواہیں ادا نہ ہونے کی وجہ سے ملازمین ہڑتال پر ہیں۔ اب کیا کریں؟؟؟ تیزہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بری طرح تھک چکے تھے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ یہ تھکن سفر سے زیادہ حالات کی تھی۔ یہ ''حالات'' کا لفظ کراچی سے ہمارا پیچھا کرتا چلا آرہا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ ملازمین غیر سرکاری طور پر کام کررہے ہیں اور سب کچھ ٹھیک ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے ہوٹل کا کمرہ، خوبصورت موسم اور اپنے علاوہ مزید سیاحوں کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔ یہاں بھی لوگوں نے ڈرایا کہ اسکردو نہ جاؤ، کالام چلے جاؤ۔ سوات کے حالات ٹھیک ہوگئے ہیں۔ ہماری ہی طرح کی ایک فیملی نے واقعی اپنا ارادہ بدل لیا اور سوات کی راہ لی مگر ہم...... ہم نے تو جانا ہی بلتستان تھا۔ یہاں تک آکر بھی اسکردو نہ جائیں...... نہیں نہیں...... صاحب نے کہا کہ اگر ہم لوگوں کی ہی سنتے رہتے تو یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ اسلئے سنو سب کی مگر کرو اپنی!

آج ہمارے سفر کا پانچواں دن تھا۔ سفر کی تھکن اتار کر 9 بجے نکلے تو کانوائے جاچکا تھا۔ ہم بشام سے گلگت کیلئے روانہ ہوئے۔ شاہراہ قراقرم فلک بوس پہاڑ دریائے سندھ کا بہتا پانی سب کچھ دلفریب تھا۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے شہر آتے رہے۔ خیبر پختوانخواہ کی ثقافت، مقامی لوگوں کا رہن سہن، دکانوں اور پھلوں کے مخصوص اسٹائل ہمیں کسی اور ہی دنیا میں لے گئے۔ واقعی اللہ تعالیٰ نے دنیا کتنی رنگین اور اس کے رہنے والے کتنے مختلف بنائے ہیں۔ اس کی صناعی اور تخلیق کی حکمتیں وہ خود ہی جانتا ہے۔ آگے کا راستہ مکمل کوہستانی تھا۔ سخت اور سنگلاخ چٹانیں ہر جگہ استقبال کو کھڑی تھیں۔ اس سفر میں ہر رنگ کے اور ہر قسم کے پہاڑ ہم نے دیکھے۔ فلک بوس چٹانوں کے درمیان اک سفر

زبردست بھی تھا اور ہیبت ناک بھی۔ میں تو نظر بھر کر پہاڑوں کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ ایک ہیبت تھی کہ جو جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ گاڑی میں قرآن پاک کی تلاوت چل رہی تھی۔

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبیؐ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی) کو نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تا کہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائیں اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کریں۔'' (الانبیا: ۳۰-۳۱)

راستے مین وہ کانوائے بھی ملا جو روزانہ مسافروں کو بشام سے گلگت لے کر جاتا ہے۔ 35 سے 40 NATCO کی بسوں کو پیچھے چھوڑ کر ہم واپس شاہرہ قراقرم پہ سکون سے گاڑی دوڑا رہے تھے۔ راستے میں دیا مربھا شاڈیم کی سائٹ دیکھی۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بہترین نعمتوں سے نوازا ہے۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف دیوہیکل پہاڑی چٹانوں کے درمیان ڈیم کیلئے آئیڈیل جگہ ہے۔ اگر یہ کسی اور ملک میں ہوتا تو کب کا بن چکا ہوتا اور ملک کا بڑا حصہ بجلی میں خود کفیل ہوتا......ساڑھے تین کے قریب ہم چلاس پہنچے۔

چلاس شاہراہ قراقرم پر سطح سمندر سے 150 فٹ بلند نانگا پربت کے فٹ پر واقع ہے۔ پہاڑوں کی بلندی کی وجہ سے مون سون ہوائیں شہر میں داخل نہیں ہوسکتی اسلئے بارش بہت کم ہوتی ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں درجہ حرارت 10 ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ ہم غلطی سے چلاس شہر میں داخل ہو گئے۔ دکانیں بند تھیں، ٹریفک نہیں تھا اور جا بجا فوجی نظر آ رہے تھے۔ واپسی پر شاہراہ قراقرم پر آنے کے بعد شنگریلا ریسٹورنٹ پہ رکے۔ نماز پڑھی، مقامی افراد سے آگے کے حالات معلوم کئے۔ ہوٹل کے باہر بہت ساری گاڑیاں اور سکیورٹی تھی اور اندر غیر ملکی سیاحوں کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ ان پہاڑوں کے بعد بلتستان شروع ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ شاہراہ کے بل بھی کچھ کم ہو جاتے ہیں۔ یہاں سڑک کچھ خراب ملی ورنہ پورے راستے قراقرم ہائی وے لہراتی، بل کھاتی، شرماتی چلتی چلی جاتی ہے۔ ہلکے ہرے دھانی، سبز، سرخ، مٹیالے پہاڑ

اور پہاڑوں سے بہتے ہوئے چشمے، موسم اور راستے کی تبدیلی کا پتہ دے رہے تھے۔

آگے فیری میڈوز کو جانے والا راستہ نظر آیا۔ بہت ساری جیپیں کھڑی تھیں۔ کچھ ہوٹل اور ریستوران بھی تھے۔ نانگا پربت جہاں غیر ملکی سیاحوں کا قتل ہوا وہ فیری میڈوز سے دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔ انتہائی مشکل راستوں پر اس طرح کی کارروائی پاکستان کو بدنام کرنے اور سیاحت کو تباہ کرنے کی بہت بڑی سازش ہے تاکہ جس طرح ہمارے کھیل کے میدان ویران ہیں اسی طرح سیاحتی مقامات بھی سنسان ہوجائیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دشمن ہمارے ملک میں اس طرح گھس چکا ہے کہ ہمارے میدان، دریا، پہاڑ، سمندر سب کے سب غیر محفوظ ہو چکے ہیں۔ ہماری منزل گلگت تھی۔ اس سے پہلے جگلوٹ پر رک کر کھانا کھایا، نماز پڑھی اور واپس شاہراہ قراقرم پر آ گئے۔ آگے شاہراہ قراقرم بہت چوڑی ہوجاتی ہے۔ جابجا چینی انجینئرز سڑک کو چوڑا کرنے میں مصروف تھے۔ لینڈ سلائیڈنگ کی جگہوں پر سرنگیں بن رہی ہیں اور انتہائی پیشہ ورانہ مہارت سے بہترین سڑک تیار ہو رہی ہے۔ آئندہ چند سالوں میں شاہراہ قراقرم مکمل طور پر نئی ہوجائیگی۔

راستے میں دریائے گلگت، دریائے سندھ میں آکر گرتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دنیا کے تین بڑے پہاڑی سلسلے ہمالیہ، ہندوکش اور قراقرم آکر ملتے ہیں۔ یہاں رک کر ہم نے تصاویر بنائیں۔ اس وقت ہم دریائے سندھ سے بہت اوپر تھے۔ تقریباً 10 گھنٹے کا سفر کر کے گلگت پہنچے۔ تھکن کی وجہ سے فوراً ہی سو گئے۔ 27 جون سفر کا چھٹا دن تھا۔ گلگت سے نکل کر اسکردو کا رخ کرنا تھا۔ سب بہت پرجوش تھے۔ ہر چوٹی K2 لگ رہی تھی۔

شاہراہ قراقرم سے اتر کر دریا کو عالم برج کے ذریعے پار کیا۔ برج سے پہلے ایک بورڈ پر لکھا تھا Look The Killer mountain at your left Nanga Parbat واقعی بہت دور بادلوں اور برف کی چادر سے ڈھکی نانگا پربت نظر آ رہی تھی اس برج پر ایک وقت میں ایک ہی گاڑی جاسکتی ہے۔ برج سے گزرتے ہوئے پل صراط پر گزرنا یاد آ گیا۔ دعائیں پڑھیں اور دل تھام کر یہ مرحلہ گزارا۔ برج پر ایک بہت بڑا پاکستانی پرچم دیکھ کر اچھا لگا۔

عالم برج سے اسکردو تک کا سفر 2 گھنٹے کا ہے۔

سفر انتہائی خوشگوار اور مناظر دلکش تھے۔ اسکردو روڈ بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہیں ہے۔ موسم ٹھنڈا اور ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ پہلی بار گاڑی کا اے سی بند کر کے شیشے کھول لئے۔ بچے بھرپور تفریح کے موڈ میں تھے۔ ہر منظر کو کیمرے میں محفوظ کر رہے تھے۔ دریائے سندھ کبھی ہمارے بہت قریب آجاتا اور کبھی بہت دور چلا جاتا۔ کہیں پہاڑ کوئلے کی طرح کالے تھے اور کہیں کہیں دھاری دار۔ کچھ پہاڑ تو ایسے تھے کہ جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی نے بہت بڑی چاک سے لائنیں ڈال دی ہیں۔ جا بجا پہاڑوں سے چشمے بہہ رہے تھے۔ ہم نے جگہ جگہ گاڑی روک کر پانی پیا بھی اور بوتلوں میں بھرا بھی۔ ایک جگہ تو گاڑی بھی آبشار کے نیچے کھڑی کر کے بیٹھے بیٹھے دھوڈالی۔ کوہستان سے بلتستان انتہائی خوبصورت وادیاں دریائے سندھ کی روانی، جا بجا چھوٹے چھوٹے خوبصورت گاؤں...... خوبانی اور شہتوت کے بے شمار درخت، خوبانی جیسے گالوں والے بچے خوبانیاں کے لئے کھڑے تھے اور ہاتھ سے روک روک کر خوبانیاں بانٹ رہے تھے۔ بیس روپے میں تازہ اور رس بھری ہلکی اورنج رنگ کی ڈھیروں خوبانیاں ...... پورے سفر کے دوران ہر جگہ ہمیں اردو بولنے والے، چھوٹے چھوٹے اسکول، جگہ جگہ پاک فوج کی بنائی ہوئی یادگاریں ملیں۔ پہاڑوں میں جہاں چشمے بہتے ہیں وہاں گاؤں آباد ہوگئے ہیں اور ہوٹل ہیں جو مسافروں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں۔ دور دراز علاقوں میں بھی آپ کو پیپسی، نیسلے واٹر، لیز چپس ضرور ملیں گے۔ دریائے سندھ سڑک کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف رواں دواں دریا راستے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آخر کار شام 5 بجے کے قریب ہم اسکردو پہنچ گئے۔ سطح سمندر سے 200 فٹ بلند اسکردو شہر خوبانیوں کے قرینے سے لگے درختوں، دریائے سندھ کے نسبتاً ٹھہرے ہوئے پانی کے ساتھ ہمارے استقبال کر رہا تھا۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

سب سے پہلے کچورہ کا علاقہ ہے جہاں شنگریلا ریزورٹ اور کئی اچھے ہوٹل ہیں۔ راستے میں ایئر پورٹ، بڑے اسکول اور فوجی مراکز ہیں۔ ہم نے شہر کے اندر رہنا پسند کیا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم سب نے گرم کپڑے پہنے اور PTDC

ہوٹل میں جا کر رات کا کھانا کھایا۔

اگر پوری طرح اسکردو گھومنا چاہیں تو کئی دن درکار ہونگے۔ جگہ ہی اتنی خوبصورت ہے ہم پہلے دن اپر کچورہ اور لوئر کچورہ گئے جو شہر سے 25 سے 30 منٹ کے فاصلے پر 30 کلومیٹر دور ہے۔ انتہائی خوبصورت دو جھیلیں، جو کم و بیش ایک جیسی ہیں۔ لوئر کچورہ کے گرد شنگریلا ریزورٹ ہیں۔ آس پاس سیب اور چیری کے درخت ہیں۔ انتہائی خوبصورت اور سرسبز جگہ ہے۔ ٹکٹ لے کر جانا پڑتا ہے۔ یہاں ایک گھنٹے ٹھہرنے کے بعد ہم اپر کچورہ گئے۔ دلفریب مگر کچا راستہ ہے۔ جا بجا چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ آخر کا کچھ راستہ گاڑی پارک کرنے کے بعد پیدل کا ہے۔ سنہرے کھیتوں سے گزرنے کے بعد اپر کچورہ جھیل آتی ہے۔ شیشے کی طرح صاف ستھرا پانی، مچھلی، کشتی کی سیر اور دل لبھانے والے مناظر......مقامی بچے پہاڑوں سے کود کود کر جھیل میں نہا رہے تھے۔ ہم نے درختوں سے توڑ کر شہتوت کھائے۔ تازہ ٹراؤٹ فش سے لطف اندوز ہوئے۔ آج جمعہ کا دن تھا۔ مساجد سے خطبے کی آوازیں آرہی تھیں۔ واپسی کے راستے میں جا بجا بچوں اور خواتین کی ٹولیاں ہاتھوں میں تبرک کے لئے اپنے گھروں کی جانب رواں دواں تھے۔ واضح رہے کہ اسکردو شہر میں شیعہ آبادی زیادہ ہے۔ واپسی پر اسکردو بازار سے خشک میوے، سبز چائے بلتستانی ٹوپیاں اور پہاڑوں سے نکلے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی چیزیں خریدیں۔

اگلے دن خپلو کا قصد کیا۔ خپلو شہر بلتستان کے گھانچی ڈسٹرکٹ میں اسکردو شہر سے تقریباً 100 کلومیٹر دور ہے۔ اتنے دور دراز علاقوں میں بھی آبادی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے، سنہری بالیوں میں لگی گندم اور جگہ جگہ گندم کو علیحدہ کرنے والی مشینیں، فروٹ نرسریز، دریا کو پار کرنے کیلئے بنائے گئے برج فوجی ٹرک اور اکا دکا گاڑیاں......ہم اس وقت دنیا سے بہت دور قدرتی نظاروں میں کھو گئے۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

زمین کی سنہری مٹی اور جھاڑیاں اودے رنگ کی تھیں۔ میں سوچنے لگی کہ اللہ تعالیٰ جب تو نے دنیا اتنی حسین بنائی ہے تو جنت کتنی خوبصورت ہوگی۔ پورے ماحول میں نرمی اور خوشی گھلی ہوئی تھی۔ مقامی افراد، خوبصورت بچیاں اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ہمیں دیکھنے لگیں۔ ہم ان کو ہاتھ ہلا دیتے تو وہ

بھی مسکرانے لگتیں۔ اتنے دور دراز علاقوں میں آبادی بھی ہے اور زندگی کی سہولیات بھی۔ اور یہ ہے ہمارا پیارا پاکستان......کیا کچھ نہیں ہے اس میں......

اسکول کے بچوں کا ایک گروپ اپنے استاد کے ساتھ بڑا پاکستانی پرچم لے کر مارچ کر رہا تھا۔ اسی طرح خوبصورت نظاروں کے درمیان خپلو شہر آ گیا۔ ہم کو خپلو فورٹ جانا تھا۔ 1840 میں قائم ہونے والا بلتستانی بادشاہوں کا یہ قلعہ چیری کے باغات کے دامن میں شہر کے بلند ترین مقام پر واقع ہے۔ اب یہ سرینا ہوٹل بن چکا ہے۔

قلعہ بلتستانی ثقافت کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ پرانے زمانے کے برتن، شاہی مہمان خانہ، بادشاہ کے رہائشی کمرے، گندم ذخیرہ کرنے کے تہہ خانے، زیورات اور نہ جانے کیا کچھ اس قلعہ میں محفوظ ہے۔ شدید سرد موسم کی وجہ سے چھتیں نیچے ہوتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بادشاہ بھی وہ عیاشی نہیں کرتے تھے جو آج ہم کرتے ہیں۔ سرینا میں ناشتہ کیا، نماز پڑھی، چیری کے باغات سے تازہ، سرخ اور سیاہ چیریز کھائیں اور واپسی کی راہ لی۔ مقامی افراد کہنے لگے کہ آپ لوگ پاکستان کے ایک کونے سے آئے ہیں اور یہ دوسرا کونہ ہے اور 50 کلومیٹر آگے انڈین بارڈر ہے۔ آگے Masherbrum ہے جو کے ٹو کا بیس کیمپ ہے۔ بس یہاں پہنچ کر صاحب نے ہمت ہار دی......ورنہ میں نے تو سب کو بتا دیا تھا کہ ارادے کے ٹو سر کرنے کے تھے!!

اسکردو، کارگل روڈ پر 45 منٹ کی ڈرائیو پر ''منٹوخا آبشار'' ہے۔ یہ دراصل ہائیڈل پاور اسٹیشن کا اسپل وے ہے جو قدرتی آبشار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ انتہائی خوبصورت مقام، یخ ٹھنڈا پانی، لکڑی سے بنا جھولتا ہوا برج اور آبشار کے نیچے پانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بچے اور بڑے کراچی میں اگر اس طرح کا مقام ہوتا تو کراچی والے تو دیوانے ہو جاتے۔ سخت سردی میں خوب کپڑے گیلے کر کے ٹھٹھرتے ہوئے واپس ہوٹل پہنچے۔ کھانا کھایا اور فوراً سو گئے اگلا دن ہمارے سفر کا اہم ترین دن تھا اور ہمیں دیوسائی جانا تھا۔

دیوسائی کا مطلب ہے Land of Giants۔ کراچی سے سنتے چلے آ رہے تھے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں پریاں آ کر ٹھہرتی ہیں اور آسمان و زمین مل جاتے ہیں۔ آج پہلی بار دیوسائی جانے کے لئے ہم نے جیپ حاصل کی

ورنہ ہر جگہ اپنی گاڑی کے ذریعے خود ڈرائیو کر کے گئے دیوسائی کا راستہ جیپ ہی کے ذریعے طے ہوسکتا ہے۔ صبح ساڑھے سات ہم سب جانے کے لئے تیار تھے۔ راستے سے کھانے پینے کی اشیا خریدیں کیونکہ دیوسائی میں ہوٹل وغیرہ نہیں ہیں اور ہو بھی نہیں سکتے کیونکہ یہاں پر سردی کی وجہ سے رکنا ناممکن ہے۔ دیوسائی نیشنل پارک کا ٹکٹ لیا اور عازم سفر ہو گئے۔

جیپ خوب ہچکولے کھاتی ہوئی دیوسائی کی جانب رواں دواں تھی۔ راستے میں سدپارہ جھیل ہے جو اب سدپارہ ڈیم بن چکا ہے۔ اسکردو شہر میں بجلی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہائیڈل پاور اسٹیشن بنے ہوئے ہیں جن سے سستی بجلی آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔ گیزر تک بجلی سے چلتا ہے اور بل بھی چند سو روپے کا آتا ہے۔ سدپارہ کی خوبصورتی دیکھ کر دل چاہا کہ رک جائیں مگر واپسی میں رکنے کا پلان کر کے آگے بڑھ گئے۔

تقریباً ۳ گھنٹے کا سفر طے کر کے پہاڑوں اور چشموں کے درمیان ہم دیوسائی پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت! اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان اتنی بلندی پر پھر ہموار میدانی علاقے شروع ہو گئے۔ سطح سمندر سے 13,497 فٹ بلند دنیا کے دوسرے اونچے ترین میدان ہیں جو کوہ قراقرم اور مغربی ہمالیہ کی حدود میں واقع 13000 اسکوائر کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے، پوری دنیا کی توجہ کا مرکز ہیں۔ دفاعی لحاظ سے آئیڈیل...... کچھ غیر ملکی طاقتیں یہاں ائرپورٹ بنانا چاہتی ہیں تاکہ یہاں بیٹھ کر پاکستان، افغانستان، چین، بھارت سب پر نظر رکھی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو کیا کچھ عطا نہیں کیا۔ اگر ہم شکر گزار ہوتے اور کفران نعمت نہ کرتے تو اس وقت دنیا کی طاقتور ترین قوم ہوتے! اے کاش ایسا ہوتا......

ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی روکی اور ہم نے قدم باہر نکالے۔ سردی سے جم گئے۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے ڈرائیور نے آگے جانے سے منع کیا۔ پھر بھی باہر نکل کر کچھ دیر مزہ لیا اور واپس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کچھ دور آگے ''بڑا پانی تھا''، جس کو عبور کرنے کے لئے پُل بنا ہوا ہے۔ پرانا پُل توڑ کر حکومت نے نیا بنایا ہے۔ سیاح یہاں اتر کر تصاویر بنا رہے تھے۔ بادل اتنے نیچے تھے کہ ہم بادلوں میں ہی چھپ جا رہے تھے۔ دنیا میں ماحولیاتی تبدیلیوں پہ تحقیق کرنے والی اٹالین ٹیم نے کیمپ لگایا ہوا تھا۔

1993ء میں دیوسائی پلینز کو دیوسائی نیشنل پارک کا درجہ دیا گیا تا کہ ہمالین براؤن بئیر (Himalyan Brown Bear) کی نسل کو بچایا جاسکے۔ اس اقدام کی وجہ سے 1993ء میں دنیا میں 19 براؤن بیئر تھے جن کی تعداد 2005ء میں 40 تک جا پہنچی۔ گولڈن مارموٹ، ریڈفوکس، Bzou وغیرہ یہاں کے خاص جانور ہیں۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے درخت نہیں ہوتے۔ چھوٹے چھوٹے انتہائی خوبصورت پودوں اور جڑی بوٹیوں سے یہاں کی ڈھلانیں ڈھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ تقریباً 140 مقامی اور مہاجر پرندے یہاں کے مکین ہیں۔ چڑیوں نے زمین پر ہی گھونسلے بنائے ہوئے تھے۔ خوبصورت چھوٹے سے گھونسلے میں رکھے ہوئے ننھے منے انڈے دیکھ کر اللہ کی قدرت کا گہرا احساس ہوا۔ ہزاروں فٹ بلندی پر اس چھوٹی سی چڑیا کے انڈوں کی حفاظت کرنیوالا ہمارا رب کس کس کی کہاں کہاں حفاظت کر رہا ہے۔

ہماری گاڑی نیشنل پارک میں گھماتی پھراتی شیوسر جھیل تک لے آئی جو سطح سمندر سے 13589 فٹ بلند ہے اور دیوسائی کی وادی چلم میں واقع ہے۔ شیوسر کا مطلب ہے اندھی جھیل۔ برف پوش پہاڑوں سے گھری جھیل کے آس پاس زمین انتہائی نرم اور دبیز قالین کی مانند ہے اور پاؤں دھنسنے لگتے ہیں۔ شیشے سے بھی زیادہ صاف ستھرا پانی اس کی خصوصیت ہے۔

جھیل پر کچھ دیر گزارنے کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ راستے میں خانہ بدوش قافلے نظر آئے۔ ہمارے ڈرائیور نے بتایا کہ یہ پنجاب کے علاقے کے لوگ ہیں جو گرمیوں میں یہاں تک آجاتے ہیں اور سردیوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی ان کا طرزِ زندگی ہے۔ میں سوچنے لگی کہ پہاڑوں میں اس طرح کے راستے انہیں خانہ بدوشوں کے دریافت کردہ ہوں گے۔ Mule Tracks رفتہ رفتہ قراقرم بن گئے۔ ہمارے لیے شاہراہ کا سفر ہی تھکا دینے والا ہے اور اس کو تعمیر کرنے والے پتہ نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہوں گے۔ واقعی یہ شاہراہ دنیا کا عظیم ترین عجوبہ ہے۔

راستے میں رک کر ٹراؤٹ پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور واپسی کی راہ لی۔ شدید تھکن کی وجہ سے سدپارہ جھیل رکنے کا پروگرام منسوخ کیا اور دور ہی سے جھیل اور ڈیم کا نظارہ کرتے ہوئے شام تک اسکردو واپس آگئے۔ رات کو PTDC ہوٹل میں K2 Italia Museum کے نام سے نمائش دیکھی۔ بلتستان اور اس کی تہذیب کے بارے میں دلچسپ تصاویر اور معلومات یہاں فراہم کی گئی ہیں۔ یہ نمائش اطالوی باشندوں کی

محنت کا نمونہ اور ان کی K2 سے محبت کا اظہار تھی۔

دس دن کے ٹور کے بعد اب ہمارا واپس کراچی کا سفر شروع ہونے کو تھا۔ اسکردو مزید رکنے کا تقاضا کر رہا تھا۔ مگر سچی بات یہ تھی کہ اب ہمیں گھر شدت سے یاد آ رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر دل اڑا جا رہا تھا کہ ابھی مزید چار دن کا طویل سفر کرنے کے بعد گھر پہنچیں گے۔ پیر، یکم جولائی صبح 5 بجے اسکردو کو الوداع کہا اور خوبصورت وادیوں، اونچے پہاڑوں اور بہتے دریا کو پیچھے چھوڑ تے ہوئے شام تقریباً 6 بجے بشام پہنچے۔ PTDC کے اسی ہوٹل کے اسی کمرے میں جا کر ٹھہرے اور ٹی وی کھولا تو مصر میں مرسی حکومت کا تختہ الٹنے کی خبر چل رہی تھی۔ دل ڈوب گیا۔ دیر تک خبریں سنتے دل دکھاتے رات گزاری۔ صبح سویرے بشام سے نکل کر ایبٹ آباد، نتھیا گلی اور مری سے ہوتے ہوئے چیئر لفٹ کی سیر کر کے رات 9 بجے اسلام آباد پہنچے۔ اگلے دن اسلام آباد سے بہاولپور جانے کے لئے موٹروے پر آ گئے۔

موٹروے پر گاڑی چلانا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ ٹریفک کم ہے۔ ایک خاص رفتار پر سیٹ کر کے گاڑی خود بخود چلتی رہتی ہے اور مشکل اس لیے کہ اتنی آسان سڑک ہونے کی وجہ سے ڈرائیور کو نیند آتی ہے۔ راستے میں انتہائی اچھی آرام کرنے کی جگہیں ہر طرح کی سہولیات کے ساتھ موجود ہیں۔ پنجاب کے بیسیوں شہروں، دیہاتوں سے گزر کے رکتے رکاتے بہاولپور میں رات گزار کر شام 7 بجے کے قریب کراچی ٹول پلازہ عبور کیا۔ ہمیں اس کے پاس جانے کی جلدی ہو رہی تھی جسے ہم اپنے پیچھے چھوڑ آ گئے تھے اور وہ

؎ وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا

کی تصویر بنا ہمارا منتظر تھا یعنی ہمارا پیارا گھر! ہمارا یہ سفر 13 دن پر محیط تھا۔ جس میں 5184 کلومیٹر کی ڈرائیو تھی۔ گاڑی میں چلنے والی سی ڈی کے ذریعے قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ مکمل سنا۔ ایک انتہائی یادگار اور ڈھیر ساری حسین یادوں کے ساتھ سفر ختم کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اتنا مشکل سفر کسی صورت ممکن نہ تھا۔ قارئین! آپ بھی اگلی چھٹیوں میں اسکردو کا پلان بنائیں اور ایک سے زائد گاڑیوں کے ساتھ قافلے کی صورت میں سفر کریں تو بہت مزہ آئے گا۔ جہاز سے اسکردو کا سفر آسان ہے۔ موسم اچھا ہونے کی صورت میں اسلام آباد سے صرف 45 منٹ کی فلائٹ کے بعد آپ اسکردو پہنچ سکتے ہیں۔

☆☆☆

ان کی صورت نظر آئے......

اگر ہم اپنی جوانی کو یاد کریں اور پھر کچھ بیتی باتیں آپ کو سنائیں تو آپ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھیں گے گویا ہم اٹھارویں صدی کی کوئی شخصیت ہیں۔ سچی بات ہے اپنے لڑکپن کی باتوں کو یاد کرتے ہیں تو خود کو ہی یقین نہیں آتا کہ ہم اتنے پرانے ہوگئے ہیں یا دنیا اتنی تیزی سے بدل گئی ہے۔

ہمارے گھروں میں ''غض بصر'' پہ اتنا زور تھا اور ایسی تربیت کی جاتی تھی کہ نظریں کسی بڑے کے ساتھ چار تو کیا، پلکیں اٹھانا ہی ایک بہت بڑا اور بُرا کام سمجھا جاتا تھا۔ پتہ نہیں وہ تربیت تھی یا فطری حیا کے بوجھ سے آنکھیں جھکی رہتی تھیں۔ باپ، بھائی چچا، ماموں اور بزرگ خواتین کے سامنے آنچل سر سے اترنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اپنی ہم عمر بہنوں کے سامنے بھی بکل کے بل نہ کھلتے تھے۔ ذرا سیانی عمر کو پہنچے تو ان بھائیوں کا گھر میں بغیر اجازت داخلہ ممنوع ہوگیا جن کے ساتھ ''زاد'' لگا کرتا ہے اور سہولت کی خاطر جن کو آج کل کزن کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ہم جب کچھ ذرا سیانے ہوئے تو حسب معمول جیسا کہ ہوا کرتا ہے ہمارے ''سیانے پن'' کو آزمانے کے لئے دوسرے گھر بھیج دیا گیا۔ جس کی خاطر بھیجا گیا تھا وہ ہمیں چند دن کی رفاقت دے کر پردیس روانہ ہوگئے۔ کافی طویل مدت تک (لوگ باگ کہتے ہیں صرف چند مہینے ہی تو تھے) ہم اپنے سر کے تاج کو اس طرح یاد کرتے رہے جیسا کہ بچے ٹیبل یا اردو میں پہاڑے یاد کرتے ہیں۔ اور دل کے آئینے میں ہے تصویر یار، جب ذرا گردن جھائی دیکھ لی (اس لیے کہ تصویر پرس میں رکھنا یا بار بار دیکھنا چھچھورا پن سمجھا جاتا ہے) کے سہارے وقت بتاتے رہے۔

وہ بھی کیا وقت تھا (سستی کا مارا کاہل وقت) ایک ماہ میں ایک عدد خط وصول پاتے۔ لگتا ہے کبوتر کے پر سے باندھ کے خط بھیجا کرتے تھے۔ ایک ماہ تو اسی صورت لگ سکتا ہے نا خط کا جواب آنے میں! اٹھارویں صدی کا زمانہ......فون بھی نہیں ہوتا تھا براہ راست......ایکسچینج کو درخواست کرنا پڑتی تھی۔ اور پھر انتظار کرتے رہو۔ اور جب حال دل کہنے سے پہلے ہی لائن کٹ جاتی تھی۔ خیر! خدا خدا کرکے ایک خط کے ذریعے مژدہ ملا

کہ آج کل میں جرمنی میں ہوں۔ٹھیک پندرہ دن بعد جدّہ میں ہوں گا۔اسی دن کی سیٹ بک کرالی جائے۔ حکم عدولی کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ میاں سے ملنے کو زیادہ دل بے تاب تھا یا خانۂ کعبہ کی زیارت کو۔

ہاں تو قصہ مختصر سارے مراحل طے کرنے کے بعد جب میں جہاز میں بیٹھی تو اپنے استقبال کے متوقع مناظر کے بارے میں سوچنے لگی۔تو جناب کیا ہوا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے،اوسان خطا ہو گئے، پیروں سے سن کر کے جان نکل گئی اور دل کی دھڑکن اپنی تربیت بھول گئی۔رٹا لگا کر سبق یاد کرنے کا نقصان یہی ہوتا ہے کہ جب پیپر کرنے بیٹھو تو سب کچھ بھک کر کے اڑ جاتا ہے۔اب ذہن پہ جتنا زور ڈالو اتنا ہی رٹا لگایا ہوا سبق دور بھاگتا ہے۔تو بس جی ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ہمیں اپنے دل کے آئینے پہ بھی دھندسی نظر آنے لگی گئی۔ کوئی شکل واضح نہ بن پا رہی تھی۔ ہاں جی، مابدولت اپنے میاں کی شکل کو جتنا یاد کرنے کی کوشش کررہے تھے وہ اتنی ہی پردے میں چھپتی جارہی تھی۔ہم نے سیاہ شیروانی اور جناح کیپ کا تصور باندھا تو دماغ نے ٹہوکا دیا کہ وہ اب شیروانی پہن کر تھوڑا ہی آئیں گے۔ اچھا، اب شکل واضح ہونے لگی تو ایک خیال سرسرایا کہ جب تو مونچھیں نہیں تھیں اب اگر مونچھیں رکھ لی ہوں گی تو کیسے لگ رہے ہوں گے؟ بڑی مشکل سے ان کے ہونٹوں کے اوپر مونچھیں سجائیں تو ایک دم دل نے غوطہ کھایا کہ جرمنی سے آکر تو عمرہ کیا ہوگا اور ''ٹنڈ'' بھی ضرور کروائی ہوگی اور ہوسکتا ہے داڑھی بھی رکھ لی ہو۔اب ہم داڑھی اور ٹنڈ کی نسبت بنا بنا کر تصویر دل میں سجانے کی کوشش کررہے ہیں۔مگر کبھی ٹنڈ غائب ہوجاتی ہے اور کبھی داڑھی کا سائز بدل جاتا ہے کہ شاید رومال سر پر باندھا ہوگا ٹنڈ چھپانے کے لئے۔اچھا تو رومال کیسا ہوگا۔ داڑھی کا ''کٹ'' فرنچ ہوگا یا کچھ اور...... بہت سے رومالوں اور داڑھی کے ڈیزائن کے تصور نے تصویریں بنائیں مگر کچھ دل کو نہ بھایا۔پھر ہم نے تنگ آکر سوچا کہ چلو چھوڑو دل میں کیا سجانا، آنکھوں میں بسا لیتے ہیں۔ابھی آنکھوں میں بسیرا بنا ہی رہے تھے کہ دماغ نے چٹکی کاٹی۔اگر وہ جدہ پہنچے ہی نہ ہوئے تو......؟ اس لیے کہ ان کے پندرہ دن پہلے کے پیغام کے بعد ہمارا کوئی رابطہ نہ تھا۔(بھلا یہ اٹھارہویں صدی کی بات ہے کہ نہیں، اب تو ہر منٹ کی خبر ایک دوسرے کو دی جاسکتی ہے۔ کتنے صابر وشاکر تھے اس زمانے کے لوگ!)

بس جناب اس چٹکی نے آنکھوں میں بسیرے

اوردل میں بسنے کی آنکھ مچولی کے کھیل کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔

تشویش ،فکر نے متوقع حالات سے نبرد آزما ہونے کی تراکیب سوچنی شروع کیں۔ ساتھ بیٹھی خاتون کا جائزہ لیا۔ان کے بیگ میں ترجمہ قرآن مجید نظر آرہا تھا۔ ان سے استدعا کی کہ مجھے تلاوت کے لئے عنایت کر دیں۔ جلد کے بعد کا صفحہ کھولا تو ازطرف زبیدہ بلوچ لکھا تھا۔ دل کو ڈھارس بندھی جن سے انسیت اللہ تعالیٰ کے نام کی وجہ سے ہوان کا نام بھی کتنا ڈھارس بندھاتا ہے۔ اورخیال آیا کہ یہ خاتون شاید میری مدد کرسکیں۔ کچھ دیر تلاوت کی پھر ان کو بتایا کہ میرے میاں نے جدہ ائیرپورٹ پر آنے کی بابت پندرہ دن پہلے لکھا تھا اگر اب وہ نہ آسکے تو...... کیونکہ وہ جرمنی سے اپنی کار میں آرہے تھے اور دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ ''ہم مدینہ منورہ جارہے ہیں اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم آپ کو مدینہ منورہ لے جائیں گے۔''

میں نے دل میں طمانیت محسوس کی کہ چلو مدینے جانے سے بڑھ کر اورکون سی اچھی بات ہوسکتی ہے۔ مدینے کا تصور آتے ہی درود شریف کا ورد کرتی رہی۔ کچھ دیر آنکھ لگ گئی اور پھر کھانے کا وقت ہوا۔

کھانا کھا کر پھر اپنے متوقع استقبال کے مناظر میں کھونے لگی۔تو اب ہمارے شریر دماغ نے چھیڑا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی مجھے پہچان نہ پائیں۔ میں نے تو برقع بھی بدلا ہوا ہے۔ ہم تو مردوں کو نقاب کے پیچھے سے دیکھ سکتے ہیں(ہاں جی! ان دنوں آنکھیں کھلی رکھنے کا رواج نہ تھا) مگر وہ عورتوں کو گھورتے ہوئے کہیں پکڑے ہی نہ جائیں۔ کہیں کسی سے مار ہی نہ کھالیں۔انکا ایک مصرع گنگنانا یاد آیا کہ ''تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟'' تو سوچا اپنی آنکھوں سے نقاب ہٹالیں گے تاکہ وہ ہماری آنکھوں سے ہمیں پہچان سکیں۔مگر اس خیال کو جھٹکنا پڑا کہ اس طرح کی حرکت سے حیا آتی تھی۔ جب حیا کا خیال آیا تو ساتھ ہی عقل نے سمجھایا کہ سب کام عافیت سے ہوجانے کی دعا کرو۔دعا کے خیال سے دل میں تقویت کا احساس ہوا کہ میری ماں ہر لمحے میری عافیت سے پہنچنے کی دعا میں مصروف ہوگی۔

اس احساس نے سارے خدشے دور کردیئے اورہم جدہ ائیرپورٹ پر بغیر کسی مسئلے کے اپنا سامان لے کر باہر نکلے اور......

ابن آدم اور بنت حوا کی ملاقات ہوگئی!

☆☆☆

شمیم فاطمہ

غم سے نجات

خوشیوں کو ہم یکسر بھلا دیتے ہیں اور غموں کو یاد رکھتے ہیں۔ جو غم مقدر سے مل جائے اس پر بسم اللہ......
جو نہ مل سکے اسے مقدور بھر ڈھونڈتے اور اپنے اوپر لادتے رہتے ہیں کہ کچھ بھاری بھر کم نظر آئیں

یہ جو فکر و الم، رنج و غم ہیں...... کسی نعمت سے کیا کم ہیں! کہ انہیں اہل دل یوں جمع کرتے اور سینت سینت کر رکھتے ہیں جیسے اہلِ زر دولت کا انبار جمع کرتے ہیں اور سنبھالتے رہتے ہیں۔ ہمارے میرؔ جی بھی ساری عمر درد و غم جمع کرنے کی دھن میں لگے رہے اور اس جمع پونجی سے ایک دیوان کیا...... (پیسے جمع کرتے تو ہر چھ مہینے میں دو دیوان شائع کروا سکتے تھے)

یہ درد و الم، فکر و غم تمام دنیا کے اقوام کو یکساں لاحق ہوتے ہیں...... ہر جا، ہر سو، ہر گھر، ہر دیار، ہر دیہات، ہر قریہ، ہر گلی اور ہر دل میں پائے جاتے ہیں۔ درد و الم کسی کے لئے باعث تکلیف ہوتے ہیں تو کسی کے لیے باعثِ راحت! (اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا...... روح تک...... سکون اتر آیا کہ اس کو کتنا خیال ہے، بخار میں نہ پھنکتے تو یہ آرام جاں کہاں نصیب ہونا تھا!) آپ سر درد سے آہ آہ کرتے ہیں تو ڈسپرین بنانے والی کمپنی واہ واہ کرتی ہے کہ ہم نے درد کا حل ڈھونڈ لیا نا......(درد کا حل دو گولی......!!) آپ کے درد میں جتنا افاقہ ہوتا ہے انکی دوا کی مانگ اتنی بڑھتی ہے۔

درد و غم کی بہتات کے باعث نہ تو انہیں شمار کیا جا سکتا ہے نہ حدود متعین کیے جا سکتے ہیں۔ آپ کو کہیں بھی، کبھی بھی، کسی سے بھی، کتنی بھی مقدار میں غم مل سکتا ہے...... متوقع اور غیر متوقع...... مطلوبہ اور غیر مطلوبہ، (ممنوعہ اور غیر ممنوعہ) دانستہ اور غیر دانستہ! یہ ہر جگہ دستیاب ہے۔ جتنا چاہو لے لو...... لینا نہ بھی چاہو تو وہ خود اچھل کے، تڑپ کے آپ کے دامن میں آ گرتے ہیں...... اور اس کے بعد...... آپ انگشت بدنداں...... حیران و پریشان...... دلگرفتہ...... آزردہ و رنجیدہ...... اس کی دوا، اسکے چارہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں (تھک ہار کر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ جو دوا کے نام پہ زہر دے اسی چارہ گر کی تلاش ہے) کچھ درد تو معصوم قسم کے ہوتے ہیں۔ ''درد کش''

ادویہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ کچھ ڈھیٹ اور مغلوب الغضب ہوتے ہیں، مان کے نہیں دیتے۔ دوا دارو...... جھاڑ پھونک...... ڈاکٹر حکیم...... کالے بکرے کا صدقہ...... دعا وظیفہ...... سب دھرے رہ جاتے ہیں۔ سب تدبیریں الٹ جاتی ہیں یہ دردوغم کام تما کر کے ہی چھوڑتے ہیں

ہماری قوم بنیادی طور پر چونکہ غم پسند اور غم پرست قوم ہے اس لیے ہم غمگین رہنا پسند کرتے ہیں۔ خوشیوں کو ہم یکسر بھلا دیتے ہیں اور غموں کو یاد رکھتے ہیں۔ جو غم مقدر سے مل جائے اس پر بسم اللہ...... جو نہ مل سکے اسے مقدور بھر ڈھونڈتے اور اپنے اوپر لادتے رہتے ہیں کہ کچھ بھاری بھر کم نظر آئیں۔

؎ کارِ ہستی، کارِ دنیا، کارِ تمنا، کارِ غم
دوش پہ ہم نے لاد رکھے ہیں کیسے
کیسے بار غم!

جیسے جیسے زندگی مہذب، متمدن، رنگین و حسین، آراستہ و پیراستہ، ترقی یافتہ ہوتی جاری ہے، رنج والم، حزن وملال میں اسی قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر نوع کا حزن...... ہر قسم کا ملال...... ہر انداز کا غم...... ہر سانس سے ایک خوف بندھا ہوا، ہر لمحہ سے جڑا ہوا...... ہر شخص کسی مسئلے میں گھرا ہوا...... ہر کوئی مبتلائے بلا...... کسی چارہ گر کی تلاش میں سرگرداں...... کسی غم شناس، کسی ہمدرد، کسی غم خوار کا منتظر...... رد بلا اور نجات غم کے لئے کبھی اثر ورسوخ کا استعمال، کبھی طاقت وقوت کا، کبھی عہدے اور مرتبے کا...... کبھی جام وجم سامنے لا کے رکھ دیتا ہے، کبھی موسیقی سے غم غلط کر لیتا ہے...... کبھی رقص وسرور کی محفلیں آباد کرتا ہے...... کبھی حلقۂ یاراں وسیع کرتا ہے...... کبھی کسی سمت پرواز کرتا ہے، کبھی گلشن، کبھی صحرا کی طرف نکلتا ہے۔ کبھی آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے، کبھی ہنسی کو علاج غم سمجھتے ہوئے خوب ہنستا ہے اور خود کو داد دیتا ہے کہ اس کا شمار بھی بڑے اداکاروں میں ہوا، اس نے جینا سیکھ لیا...... کبھی اس گلی میں آنا جانا چھوڑ دیتا ہے جہاں جاتے ہی غم دامن گیر ہو جائے۔

جس طرح چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا اسی طرح دردوغم کا جانا بھی ایسا ہی ہے جسے ہمارے یہاں کسی حکومت کا جانا......(کل اور کسی نام سے واپس آ جانا) دردوغم کی یہ خصلت ہے پر کہ جاتے جاتے آپ کو ایک نیا غم دے جاتا ہے یا لگا جاتا ہے۔ منیرؔ ایک دریا کے پار اترتے ہیں تو دیکھتے ہیں

کہ ایک اور دریا کا سامنا ہے

جب سے یہ دارِفانی آباد ہوا ہے اس میں غم آ بسا ہے سو غم سے نجات پانے کے لئے زندگی سے نجات پانا ضروری ہے۔ (اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے!) چچا غالب کہتے ہیں کہ

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کیونکہ قید حیات میں آتے ہی سلسلہ غم کا آغاز ہو جاتا ہے (اور آہوں اور سسکیوں میں اختتام) یکے بعد دیگرے غم ملتے جاتے ہیں، زندگی سے نکلتے جاتے ہیں، پھر اسی شاخ سے نئے غم پھوٹ جاتے ہیں، ہر خوشی کے ساتھ ایک غم نامحسوس طریقے سے جڑا رہتا ہے۔

موت سے پہلے آدمی ان عارضی زخموں سے واقعی نجات نہیں پا سکتا لیکن موت ایک عارضی اور ناپائیدار زندگی کو ختم کرتی ہے اس لیے ایک شخص کی موت اس کو عارضی اور پاپیدار غم سے نجات دلاتی ہے اس غم سے نہیں جو موت کے بعد لاحق ہونے والا ہے۔ جو سب سے برا غم ہے...... جو اٹل ہے۔ (اللہ اس غم سے ہم سب کو محفوظ رکھے آمین!) اس روز کی تہی دامنی کا خوف......اس روز کی بے سروسامانی کا خوف......اس روز کی ذلت کا خوف...... جو نہ مٹ سکتا ہے نہ ٹل سکتا ہے......نہ کم ہو سکتا ہے......اس غم کے بانٹنے کے لئے نہ اماں دوڑی آئیں گی نہ ابا اپنے ہاتھ پاؤں ماریں گے...... نہ بہن بھائی کچھ کر سکیں گے...... نہ دوست احباب تسلی دے سکیں گے......نہ چچا، ماموں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر سکیں گے۔ نہ مال، نہ زر، نہ آل، نہ اولاد......کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔

نجات پانے کی جستجو...... قیدِ حیات میں رہتے ہوئے......(کہ رہائی کے بعد تو سب زنجیریں ٹوٹ جائیں گی سعی وعمل کی......امید وجستجو کی) اپنی غفلتیں شمار کرتے ہوئے، اس سے ڈرتے ہوئے، رشتہ وتعلق کو نبھاتے ہوئے......کسی کے لئے آسانیاں پیدا کرتے ہوئے، کسی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے......نبھاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے......خیر کی نیت رکھتے ہوئے...... تھکے ہوئے......ہمتیں جمع کرتے ہوئے......لڑکھڑاتے ہوئے، سنبھلتے ہوئے، ضبط کرتے ہوئے، قیدِ حیات کے حزن وملال کی لہروں سے کھیلتے ہوئے...... ڈوبتے ابھرتے ہوئے......اس سے مدد طلب کرتے ہوئے...... اس کی بنتی کرتے ہوئے......نجات کی امید اور پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہوئے!!

☆☆☆

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

برآمدے سے گزر کر میں کمرے کی طرف جانے ہی لگی تو چارپائی پر بیٹھیں ایک باوقار خاتون نظر آئیں۔ ان کو سلام کرنے وہیں کھڑی ہوگئی تو قانتہ خالہ (قانتہ رابعہ) نے تعارف کرایا کہ یہ میری امی ہیں اورانہیں بتایا کہ ثمینہ کی بیٹی اور تنویر کی بھانجی ہے۔ انہوں نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور جب مزنہ نے بتایا کہ میں سعودی عرب سے آئی ہوں تو بہت خوش ہوئیں۔ مجھے واحد(۱)،اثنین (۲)، ثلاثہ (۳)، اربعہ (۴) اورعشرہ (۱۰) تک گنتی سنائی، پھر بتایا کہ عربی بھی آتی ہے مگر اب بھول گئی ہے، لیکن میرے کھڑے کھڑے جتنے عربی کے لفظ انہوں نے بول دیئے، مجھے لگا کہ بھولنے والی بات انہوں نے محض کسر نفسی سے کام لے کر کی ہے۔

یہ تھی میری قانتہ خالہ کی امی، مومنہ آپی اوراورمزنہ کی نانی اماں سے پہلی اور واحد ملاقات۔ میں اللہ کی قدرت پر حیران ہوتی ہوں کہ کئی لوگوں کی سالوں کی رفاقت آپ کو وہ کچھ نہیں دے پاتی جو کسی کے محض دو بول یا ان کے بارے میں کی گئی کچھ باتیں دے جاتی ہیں۔ ۴ جنوری کو مزنہ سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ نانی اماں بہت بیمار ہیں۔ اور اگلے ہی دن مجھے ممانی جان سے ان کی وفات کی خبر ملی۔ اگر ایمانداری سے کام لیا جائے تو اس وقت مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ اللہ کے ولی یوں ہمارے درمیان رہتے رہتے گزر جاتے ہیں اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہاں ایک بات بار بار ذہن میں آرہی تھی کہ قانتہ خالہ کا پتہ نہیں کیا حال ہوا گا، ان سے ملنے گئے تو جا کر اندازہ ہوا کہ ماں نے شاید گھٹی میں بیٹی کو صبر دیا ہے۔

جوں جوں قانتہ خالہ ہمیں اپنی امی کی باتیں بتاتی جارہی تھیں مجھے محسوس ہوتا جا رہا تھا گویا ہم تعزیت کرنے نہیں آئے بلکہ اپنی غرض، اپنی ضرورت سے آئے ہیں، اپنا ایمان تازہ کرنے آئے ہیں۔ سوچتی ہوں کہ کئی لوگ جانے کے بعد بھی نہ جانے کس کس انداز میں فیض یاب کر جاتے ہیں۔ میں ان سے کبھی بہت لمبی ملاقات نہ کرسکی، نہ بات کرسکی، نہ ہی ان کی

زندگی کے حالات وواقعات جانتی تھی مگر جیسے جیسے قانتہ خالہ بتاتی گئیں گویا میرے آنکھوں کے آگے نانی اماں کی زندگی ویڈیو کی طرح چلنے لگی۔نشست کے اختتام تک مجھے احساس ہوا کہ جو کچھ قانتہ خالہ نے بتایا وہ تمام باتیں صرف ایسے شخص سے توقع کی جاسکتی ہیں جو اللہ کے مقربین میں سے ہو(ان شاء اللہ ، اللّھم اجعلنا منھم) پورے گھر کو اور گھر کے تمام اندورنی، خارجی امور کو احسن طریقے سے نبھانا، اور حددرجہ مصروفیت کے باوجود سب سے رابطے میں رہنا، سب کے دکھ درد کا پتہ رکھنا، سب مشکل کام ہیں، کم ازکم میرے لیے...... یہ سوچنا بھی محال ہے کہ اپنا کام کریں، حقوق العباد کا خیال رکھیں، حقوق اللہ کا خیال رکھیں، ہر خانہ خالی سا محسوس ہوتا ہے۔

اللہ! موت کی اتنی تیاری اور آخرت کا اتنا خوف!

مفہوم حدیث ہے کہ ''جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اس کے دو حرص بڑھتے ہیں، مال کی محبت اور لمبی عمر کی خواہش۔''

اب معلوم ہوا کہ جو لوگ اس حرص سے بچ جاتے ہیں ان کا آخری وقت ایسا ہی ہوتا ہے جو بہتوں کو رلا جاتا ہے اور جاتے جاتے رستہ دکھا جاتا ہے۔ وفات سے پہلے تین دن کومہ میں رہی تھیں، ایک مرتبہ جب ہوش آیا تو کہہ رہی تھیں ''**لنکوننّ من الخسرین**'' یقیناً یہ قرآنی دُعا ان کے دل سے نکل رہی ہوگی جو ہوش آنے پر زبان پر آگئی۔ان کے بارے میں ان کی بہو نے خواب دیکھا تھا کہ کوئی کہہ رہا ہے تمہاری ساس مقربین میں سے ہیں، قانتہ خالہ کی ایک اور عزیز جنہوں نے خواب میں ان کی امی کا جنت کا محل دیکھا اور بتایا گیا کہ یہ محل ان کے صبر کی وجہ سے دیا گیا ہے۔

جوں جوں قانتہ خالہ بتاتی جارہی تھیں میرے رشک اور امی سے ملنے کی حسرت بڑھتی جارہی تھی۔ساتھ اس بات کا افسوس بھی کہ میں ان سے دعا نہ کرا سکی۔ بیماری میں ان کے چہرے پر بے تحاشا جھریاں آگئی تھیں اور وفات کے کچھ دیر بعد تک ان کا چہرہ ایسا تھا گویا کسی جوان کا چہرہ ہو، بنا کسی نشان اور جھریوں کے، دل ہی دل میں مجھے وہ بوڑھی خاتون یاد آئی جس کو رسولؐ اللہ نے کہا تھا کہ کوئی بوڑھی جنت میں نہیں جائے گی، جس پر وہ رونے لگی تو آپؐ نے فرمایا کہ جنت میں ان کو جوان کردیا جائے گا۔ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلاتے ہی جوانی عطا کردی۔

ہر وقت ان کی زبان پر ذکر جاری رہتا، کبھی کوئی

گلہ شکوہ نہ کرتیں۔ جو مل گیا کھا لیا جو مل گیا پہن لیا، دل سب سے صاف رکھا (جو نہایت مشکل کام ہے، یقین جانیں، ہم زبان سے معاف کر دیتے ہیں دل سے کوئی کوئی معاف کرتا ہے)، ساری باتیں سن کر ایسا لگا یا اللہ! اب بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں!! وہ ساری عمر سکول نہیں گئیں، خود ہی پڑھنا سیکھا اور شریعت، وصیت سب کا علم تھا۔ جس بات پر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے ۴۰ سال پہلے اپنا کفن خود تیار کر کے اور اس میں صابن خود بنا کر رکھا تھا۔ سوچتی ہوں کہ کوئی رب سے ملنے کا اتنا مشتاق ہو تو اللہ بھی دکھا دیتا ہے کہ وہ کس قدر مشتاق ہے!

ان کے سارے جسم میں کینسر پھیل چکا تھا، اور جب ان کو بتایا گیا کہ ڈاکٹروں نے انہیں جواب دے دیا ہے تو انہوں نے جواب میں الحمدللہ کہا اور یہ کہ وہ اپنے رب کی رضا میں راضی ہیں مگر ڈر اس بات کا ہے گناہوں کی گٹھری لے کر اس کے سامنے کیسے جائیں گی ان کی گٹھری کا بوجھ تو اللہ نے اس دنیا میں اتار دیا تھا، سخت مالی، جسمانی آزمائش کے ذریعے۔ ڈاکٹروں نے ان کی وفات سے ڈیڑھ مہینہ پہلے ان کو جواب دے دیا تھا کہ یہ چار دن تک زیادہ سے زیادہ زندہ رہیں گی۔ رپورٹ کے مطابق ان کے گردے اور پھیپھڑے جواب دے گئے تھے۔ کینسر ہڈیوں میں پہنچ چکا تھا اور آخری دنوں میں کان میں آ گیا تھا۔ جب ہوش میں ہوتیں تو صرف ''اللہ'' یا ''ربی'' کہتیں۔ انہوں نے اللہ سے صبر ایوبؑ مانگا تھا، اور ان کو صبر ایوبؑ عطا کیا گیا۔ بیماری بھی ایسی تھی کہ جسم کے ایک ایک حصے تک تھی، بیس سال سے مسلسل باوضو تھیں یہاں تک کہ اگر رات کو وضو ٹوٹ جائے تو وہیل چیئر پر وضو کرنے جاتی تھیں، حافظہ ایسا تھا کہ صلوۃ حاجت کی دعا امام کعبہ کے پیچھے پیچھے ایک دفعہ پڑھ کر یاد کر لی۔ ترکی زبان بھی آتی تھی جو حج پر ایک ترک خاتون کے ساتھ رہ کر سیکھی۔ یہ حافظہ ان کے تقویٰ کا ثبوت ہے، یہاں مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ امام شافعیؒ اپنے استاد کے پاس اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت لے کر گئے تو انہوں نے کہا ''گناہ کرنا چھوڑ دے'' (مطلب گناہوں سے اجتناب حافظے کی قوت بڑھا دیتا ہے)۔

حیرت کی ایک بات یہ بھی تھی (ساری ملاقات میں میں حیران ہی ہوتی رہی) کہ انہوں نے اپنی زندگی میں وصیت لکھی اور کئی سال پہلے ہی اپنے جو اثاثہ جات

تھے وہ وراثت کی مد میں تقسیم کر دیئے، پاس رکھا تو ضرورت کے برتن، بستر اور دعا کرتیں تو کہتیں کہ ''یا اللہ! یہ سامان میرا نہیں ہے، مجھ سے اس کا حساب نہ لینا۔'' انہوں نے اپنا سفر ختم کیا اور اس منزل پر پہنچیں جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے اور اس دنیا میں ہماری حیثیت ہی کیا ہے، محض ایک مسافر، ایک قیدی اور ایک راہگیر! ہم یوں رہتے ہیں گویا یہی اصل ہے! یہ دنیا ہی ہمارا جینا، مرنا، اوڑھنا، بچھونا ہے! اچھے اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس دنیا سے رخصت ہو گئے اس حال میں کہ اللہ ان سے راضی تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ بھی ایمان پر کرے اور اس حال میں ہمیں واپس لے کہ وہ ہم سے راضی ہو۔ ہمیں اپنی محبت عطا کرے اور اپنی محبت کا حقدار بنائے، کہ باوقار زندگی تو شاید بہت لوگ گزار لیں، باوقار موت اللہ والوں کو نصیب ہوتی ہے۔

☆☆☆

ڈپریشن پر قابو پایئے

قرآن وسنت اور سائنس کی روشنی میں چند مشورے جو ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں

ڈپریشن کیا ہے؟ ہر شخص اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی اداس ہوتا ہے۔ یہ اداسی وقتی طور پر انسان کو متاثر بھی کرتی ہے لیکن انسان اس حالت سے جلد ہی باہر آجاتا ہے اور اپنے روزمرہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جبکہ ماہرین کے مطابق ڈپریشن ایک ایسی سیریس بیماری ہے جس میں انسان میں اداسی اور ناامیدی پائی جاتی ہے اور وہ خود کو غیر اہم محسوس کرتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اس کے روزمرہ کے کام بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں، اس کے کھانے پینے، سونے جاگنے کی روٹین ڈسٹرب ہوتی ہے۔ انسان ہر وقت تھکاوٹ اور بے چینی میں مبتلا رہتا ہے۔ اپنے پسندیدہ کاموں میں بھی اس کا دل نہیں لگتا، چھوٹے موٹے کاموں کا فیصلہ کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے اور خود کو نقصان پہنچانے یا خودکشی کے خیالات کا بھی شکار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کم از کم دو ہفتے اور بعض اوقات مہینوں تک طاری رہتی ہے۔

کراچی یونیورسٹی کی ڈاکٹر احسانہ ڈار اپنے لیکچر 'Depression and its control' (ڈیلی ٹائمز ۲۸ مئی ۲۰۱۲) میں بتاتی ہیں کہ دنیا بھر میں ۲۰ فیصد لوگ جبکہ پاکستان میں تقریباً ۳۴ فیصد لوگ اس مرض کا شکار ہیں۔ طبی تحقیق کے مطابق یہ بیماری عموماً خواتین میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ سبین بیگم (جنوری ۲۰۱۳) ڈیپریشن سے بچنے اور اس کے علاج کے لئے تین اہم طریقوں یعنی روحانی، جسمانی اور جذباتی علاج پر فوکس کرتی ہیں۔

ان تینوں اقسام کے علاج کے لیئے کئی ایک ٹپس ملتی ہیں جو ڈیپریشن میں بہت کارآمد ہوتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس مہلک مرض سے بچنے کے کیا طریقے ہمیں قرآن وسنت اور سائنس سے ملتے ہیں تاکہ ہم خود اس سے بچنے، اس کا درست علاج کرنے اور دوسروں کی مدد کرنے کے قابل ہوں۔

روحانی علاج: ہم سب کے لئے خوشی کی خبر یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہر مرض کا علاج پیدا کیا ہے جیسا کہ

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالی نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کا علاج نہ پیدا کیا ہو(بخاری)

۱)ایمان باللہ اور عمل صالح: جناب عبدالرحمٰن بن ناصر اپنی کتاب 'غم کا علاج' میں رقمطراز ہیں کہ دنیاوی مصائب اور تکالیف سے نجات اور دل کا سکون و اطمینان حاصل کرنے کا سب سے بنیادی اور خالصتاً اصلی ذریعہ ایمان باللہ اور عمل صالح ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ایمانِ کامل اور یقینِ محکم والے لوگ اپنی استطاعت کے مطابق اپنی مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور غموں اور دکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دلوں کے اطمینان اور سکون کے لئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

۲) صبر کرنا: کسی بھی قسم کی تکلیف یا بیماری میں صبر کرنا بے حد ضروری ہے کیوں کہ اللہ نے خود ہی قرآن میں فرمادیا کہ ترجمہ، اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے' (البقرہ:۱۵۳) صبر کرنے کا مطلب ہے کہ خود کو ناپسندیدہ کاموں سے روک لینا۔ یعنی ایسے کاموں اور باتوں سے بچنا جو اللہ کی ناراضگی کے ہوں۔ صابر انسان کا دل ایک سکوں کی حالت میں رہتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے اس مشکل میں تنہا نہیں چھوڑا بلکہ اللہ کی مدد ہر وقت اس کے ساتھ ہے اس لئے وہ بیکار کاموں اور سوچوں سے بچتا ہے۔

۳) نماز سے مدد لینا: اوپر درج آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے ساتھ ہی نماز بھی انسان کو مشکلات میں مدد دیتی ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالی سے مضبوط کرتی ہے۔ کیونکہ انسان سجدے کی حالت میں اللہ کے سب سے قریب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے''واسجد واقترب یعنی''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ'' (العلق:۱۹)۔ سنت سے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ہر مشکل میں نماز کی ہی بڑھتے تھے۔ نماز کی پکار یعنی اذان کے الفاظ پر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ ہمیں نماز اور کامیابی کی طرف بلایا جاتا ہے۔ جب موذن کہتا ہے کہ حَیّ علی الصلوٰۃ اور حَیّ علَی الفلاح یعنی آؤ نماز کی طرف اور آؤ کامیابی کی طرف تو پھر ہم اس پکار پر کیوں نہ عمل کریں اور اپنی نمازوں سے مدد لیں۔

۴) شکرگزاری: اللہ کی بہت سی نعمتیں ہمیں ملتی ہیں لیکن ہم کسی ایک نعمت کے نہ ملنے، خواہش کے پورا

نہ ہونے پر باقی سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اداس ہو جاتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالی ہے" حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے"(۱۰۰:٦)۔ شکر گزار بندے کو اللہ تعالی اور نوازتا ہے ارشاد ہوتا ہے" اگر تم شکر کرو گے تو میں تمکو اور زیادہ (نعمتیں) دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے" (ابراہیم:۷)۔مزید فرمایا" پس تم میرا ذکر کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور میری شکر گزاری کیا کرو اور میری ناشکری نہ کرو" (البقرہ:۱۵۲)

شکر گزار ہونے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے سے کم تر کی طرف نظر کی جائے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا تھا کہ،" میں ہمیشہ اپنے ننگے پاؤں کا اللہ سے شکوہ کرتا تھا اور پھر ایک دن میں نے ایک شخص دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے اس کے بعد میں نے اللہ سے شکوہ کرنا چھوڑ دیا بلکہ اس کا شکرادا کرنے لگا کہ کم از کم اس نے مجھے دو پاؤں دیئے ہیں"۔ ناشکری کے بجائے اگر ہم اپنے پاس موجود بہت سی نعمتوں کو شمار کرنے لگ جائیں تو کبھی بھی اداس نہ ہوں۔اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی مشق آپنی آگہی کے لیے ضرور کریں۔ کسی خاموش جگہ اکیلے بیٹھ جائیں اور جو نعمتیں آپ کو ملی ہیں ان کو کاغذ پر لکھتی جائیں۔ پھر ان خواہشات کو جواب تک پوری نہیں ہوئیں دوسرے کالم میں لکھیں۔یقیناً آپ کی نعمتوں کی لسٹ نہ ختم ہونے والی جبکہ محرومیاں چند ایک ہی ہونگی۔

۵) دعاؤں سے مدد لینا: دعائیں مومن کا ہتھیار ہیں ان کا خوب استعمال کریں۔انبیاً کرام نے مختلف مواقع پر دعاؤں سے مدد لی مثلاً حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں آیتِ کریمہ پڑھی اور اللہ نے ان کی مشکل کو آسان کر دیا۔اسی طرح نبی ﷺ نے بھی رنج و غم کے موقع پر مختلف دعائیں مانگی ہیں ہم ان دعاؤں سے خوب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔اسی طرح ہم اللہ تعالی سے بہت استغفار کریں اور اپنے گناہوں کی خوب معافی مانگیں تو انشااللہ ضرور افاقہ ہوگا آزمائش شرط ہے۔

٦) صدقہ کریں: اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے والا ہے اور دل میں خوشی بھرنے والا عمل ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا" تمہارا اپنے بھائی کے لئے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے"(ترمذی)

اب ہم ان طریقوں کی بات کرتے ہیں جو ہماری جسمانی صحت اور تندرستی کے ضامن ہیں:

۱) متوازن غذا کا استعمال کریں: اپنی روزمرہ کی خوراک کا خیال کریں ریسرچ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اشیا جن میں اومیگا ۳ کی کثرت پائی جاتی ہے ہمارے موڈ کو بہتر بناتی ہیں لہٰذا مچھلی، اخروٹ اور السی کے بیجوں کا خوب استعمال کریں اس کے علاوہ تازہ پھل، سبزیاں، دودھ، دہی وغیرہ بھی آپ کی خوراک کا لازمی حصہ ہونی چاہیئں۔ انتہائی غم کے موقع پر تلبینہ (جو کا دلیہ جسے دودھ میں پکا کر شہد شامل کیا گیا ہو) کھانا بھی فائدہ مند ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ''میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ: تلبینہ بیمار کے دل کو تسکین دیتا اور بعض رنج بھی کم کر دیتا ہے'' (بخاری)۔

۲) اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں کو پورا کریں: اکثر دیکھا گیا ہے کہ غم و پریشانی کی حالت میں ہم اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑاتے ہیں اور غم منانے میں مصروف ہو جاتے ہیں جبکہ ہمیں رنج و غم میں اپنے ضروری کاموں کو کرتے رہنا چاہیئے۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ ''مصروف رہیئے ڈپریشن بھگایئے''۔

۳) زندگی کو پرمزہ بنانے کی کوشش کریں: اپنے پسندیدہ صحت مند کام کریں مثلاً اچھی کتابیں پڑھنا، باغبانی کرنا، کڑھائی سلائی کرنا یا اپنے گھر کو مختلف انداز سے سجانا وغیرہ۔ آپ چاہیں تو کوئی نیا ہنر بھی سیکھ بھی سکتی ہیں۔ دوسروں کی خدمت کا جذبہ اگر آپ میں ہو تو ضرور کسی نہ کسی قسم کے سوشل ورک میں حصہ لیں اور اس طرح دوسروں سے دعائیں اور محبتیں سمیٹیں۔

۳) اپنا خیال رکھیں: ریسرچ سے معلوم ہوتا ہے کہ رنج و غم کی حالت میں انسان سب سے زیادہ اپنی ذات سے غفلت برتتا ہے۔ لہٰذا اپنی جسمانی صفائی ستھرائی، اپنے لباس اور ماحول کی صفائی کا بھی خوب خیال رکھیں، اپنی نیند کو بہتر بنانے کے طریقے آزمائیں، کوشش کر کے کچھ وقت ضرور کھلی فضا اور سورج کی روشنی میں گزاریں۔ طبی ماہرین کے مطابق سورج کی روشنی ایک نیچرل انٹی ڈپریسنٹ ہے لہٰذا اس کا فائدہ اٹھائیں۔ اس کے علاوہ پابندی سے ورزش کرنا خاص کر چہل قدمی بھی اس ضمن میں بہت مفید ہے۔

آخر میں نفسیاتی علاج (Psychological Healing) کے لیے کچھ ٹپس حاضرِ خدمت ہیں:

۱) Talking therapy: کھل کر بات چیت کرنا۔ نفسیاتی معالجین کے مطابق Talking therapy جس کی مدد سے انسان اپنے منفی خیالات پر

قابو پا سکے اور مثبت خیالات کو پروان چڑھا سکے بہت نفع بخش ہے۔اس سلسلے میں ضرورتاً کسی سائیکولوجسٹ کی مدد لی جاسکتی ہے یا کسی پروفیشنل کونسلر سے بات چیت کی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر ڈار نے مشی گن یونیورسٹی کی محقق سٹیفنی براؤن کا حوالہ دیا ہے جس نے ریسرچ کی کہ گپ شپ ہمارے لیے کتنے فائدے رکھتی ہے۔ لارڈی کہتا ہے''اس بارے میں تحقیق بالکل واضح ہے کہ ڈپریشن کا معاملہ ہو تو تعلقات کی بہت اہمیت ہے۔جو لوگ معاشرتی روابط میں حمایت اور مدد کی کمی کا شکار ہوتے ہیں ان کے لیے زیادہ امکان ہے کہ وہ ڈپریس ہو جائیں اور کسی واقعے کا سامنا کرنے پر دیر تک ڈپریسڈ رہیں۔یہ خوش قسمتی ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ اپنے روابط کا معیار اور گہرائی بہتر بنانے پر کام کر سکتے ہیں، یہ اپنے ڈپریشن سے لڑنے اور بار بار اس کے حملہ آور ہونے سے بچنے میں بہت زیادہ فائدہ مند ہوسکتا ہے''۔

۲) اینٹی ڈیپریسنٹ دوائیاں: ڈاکٹر احسانہ ڈار کے مطابق ڈپریشن کے علاج کے لیئے کئی ایک طریقے ہیں مثلاً اینٹی ڈیپریشن دوائیاں، ہربل تھراپی اور غذائی سپلیمنٹس کا استعمال۔بعض اوقات مرض کی شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے یا انسان کو اس وقت اس مرض کا معلوم ہوتا ہے جب اس کو اوپر درج ان تمام کاوشوں پر عمل کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ کچھ لوگوں کو شروع سے ہی ادویات کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس معاملے میں غفلت برتنا کسی بڑے نقصان کا سبب ہوسکتا ہے۔مثلاً اگر کسی شخص کو خودکشی کرنے کے خیالات بار بار آئیں تو یا اس نے خودکشی کرنے کی ناکام کوشش کی ہو تو ایسے شخص کو ضرور ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔کسی اور بیماری کی طرح اس بیماری کا علاج بھی ڈاکٹر کی مدد سے کرنا چاہیئے۔ہمارے ہاں اکثر اگر کسی کو یہ مشورہ دیا جائے تو ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور ایک عام سا جواب فورا ملتا ہے کہ'' میں کوئی پاگل ہوں جو سائیکیاٹرسٹ کے پاس جاؤں''۔اس کے علاوہ معاشرے میں اس مرض کے ساتھ social stigma وابستہ ہے اور اکثر اوقات لوگ صحیح علاج میں تاخیر کرتے ہیں اسی لیئے مرض کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور پھر اس کی برے نتائج نہ صرف مریض کو بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ادویات کے سلسلے میں اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ان کو ڈاکٹر کے بتائے گئے نسخے کے مطابق ہی استعمال کریں۔

۳) کبھی کبھار مرض کی نوعیت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ایسے شخص کو ہسپتال میں داخل کرنے اور وہاں علاج کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لہٰذا اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

آخر میں یہ کہ اس مرض کے علاج میں صبر کا دامن نہ چھوڑیں، مریض کو اپنی پوری مدد فراہم کریں اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے دواؤں اور دعاؤں سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

☆☆☆

اک چھوٹی سی گواہی

(نبیلہ شہزاد۔لاہور)

چند دن پہلے باجی قانتہ رابعہ کی والدہ کی وفات کا سنا، دکھ ہوا۔ والدین تو ایسی چیز ہیں جن کی ضرورت انسان کو مرتے دم تک رہتی ہے اور دوسرا کوئی رشتہ اس رشتے کا نعم البدل نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ باجی قانتہ رابعہ کیلئے یہ ایک گہرا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

تقریباً ایک ماہ پہلے راقمہ، مدیرہ خواتین میگزین عابدہ عباس اور فرزانہ چیمہ ہم تینوں قانتہ رابعہ کی والدہ کی عیادت کے لئے گئے۔ ڈاکٹر شگفتہ نقوی صاحبہ اور قانتہ رابعہ وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔

مرحومہ ہم سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں کیونکہ وہ ادب سے شغف رکھنے والی خاتون تھیں۔ مجھے ان کی جو بات سب سے اچھی لگی وہ یہ ہے کہ بیمار اتنی ہیں کہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتیں لیکن لیٹے لیٹے ہی نماز ادا کر رہی ہیں۔ اتنی تکلیف میں بھی زبان پر شکر اللہ، الحمد للہ کے الفاظ جاری ہیں اور پرنور چہرے پر سکون ہی سکون، جب ان کی وفات کا سنا تو دل نے بے اختیار گواہی دی کہ مالک کائنات نے ضرور ان کا استقبال اپنی رحمتوں سے کیا ہوگا۔ اور ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ حدیث کے مطابق جب فرشتے مرحومہ کے حق میں دی گئی لوگوں کی گواہیاں اکٹھی کر رہے ہوں گے امید ہے کہ میرے جیسی حقیر بندی کی بھی مرحومہ کے حق میں اک چھوٹی سی گواہی شامل کر لیں (آمین)

☆☆☆

گئے دنوں کا قصہ

(رافعہ صلاح الدین۔کراچی)

گئی صدیوں کا قصہ ہے کہ جب محبت کے اظہار کے لئے دن متعین کیے بنا ہی لوگ اپنے گردوپیش کے لوگوں کا بے لوث خیال رکھا کرتے تھے۔ نا جانے وہ اتنے بے وقوف کیوں تھے کہ اپنا سب کچھ ایک اجنبی مسافر کی خدمت میں تیاگ دیا کرتے تھے مگر بدلے میں شکریہ کا احسان لینا بھی گویا ان کی غیرت پہ تازیانہ ہوتا تھا۔

محنت کش جانفشانی سے کام کیے جاتے اور صلے میں اٹھتی لہلہاتی فصل ان کی محنت کا پھل ہوتی...... وہ مٹی ڈھوتے جاتے اور کھڑی ہونے والی عمارت کی پختگی ونفاست ہی ان کی مزدوری ہوتی...... کتنے پاگل تھے ناوہ......

پھر ایسی بھی مائیں تھیں جو صلاح الدین ایوبی، بن قاسم جیسے شیر جوان جنتیں۔ بی اماں جیسی نڈر مائیں جیالے جوہر پروان چڑھاتیں ہر دکھ سہتیں مگر ہمت و کردار میں اعلیٰ اولاد کو دیکھ کر سب بھول جاتیں۔ یہ بھی تو تاریخ ساز مائیں تھیں۔ مگر کہاں! یہ گئے دور کی فرسودہ باتیں ہیں اور ہیں بھی ''مسلمان تہذیب'' کی، کہ جس نے سائنس، ریاضی، فلکیات غرض ہر علم کی بنیادیں اٹھائیں اور پختہ کر کے دوسروں کے حوالے کر دیں اور بدلے میں اگر بگڑے ہوئے نام ملے تو وہ بھی ہنس کر سہار لیے۔ موجودہ دور ہاتھ بڑھا کر چھین لینے کا ہے اور وہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر۔ رائی کا پہاڑ بنانے کا ہے، اپنی اہمیت جتانے کا ہے۔

جب تک محبت کا ڈنکا بجا کر دنیا کو بتلایا نہ جائے کہ محبت کوئی جرم نہیں تو محبت سے چور دل تو پگھلیں گے نا...... محبت تو یہی ہے۔ وہ بھی کوئی محبت تھی کہ جس میں اہل سندھ کی لڑکی ماں باپ کی محبت وعزت کی خاطر جان بچانے کے لئے بھاگتی ہے اور کسی کی حرص بھری محبت سے بچتی ہے۔ محبت تو یہی ہے کہ اخلاقی ومذہبی زنجیروں سے مبرا ہو کر کی جائے اور نہ صرف کی جائے بلکہ اسکی تلقین بھی کی جائے۔

ہم بھی کتنے پاگل ہیں نا...... اتنے بڑے بڑے ٹھوس بہانے ہیں دن منانے کے مگر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ تو بھری پڑی ہے ''دن'' منانے کے لئے مگر ہمارے تاریخ دان خاموش ہیں۔ صاحب بہادر کی جی حضوری وخوشنودی کے لئے ہم ان کی رسومات تو مان اور منا سکتے ہیں مگر اپنے عظیم ماضی کی جھلک دکھانے سے ڈرتے ہیں۔ ہم یونہی مدرز ڈے، ویلنٹائن ڈے مناتے رہیں گے اور اپنی تہذیب پہ مٹی ڈالتے رہیں گے۔ یہ ''دن'' اور اس جیسے بہت سے ''دن'' یونہی منائے جاتے رہیں گے۔ ہماری زندگی، ہماری سوچ میں اس طرح رچ بس جائیں گے کہ ہم بھول جائیں گے کہ ہم خود اپنی ایک شناخت بھی رکھتے ہیں...... ہم نادان پرندے کی طرح ''دانے'' کی آس میں اپنے گھونسلے سے اتنے دور آجائیں گے کہ واپسی ناممکن اور غلامی ممکنہ حد تک قریب ہو جائے گی۔

☆☆☆

محشرِ خیال

فریدہ خالد۔کراچی

مارچ کا بتول ملا،''ابتدا تیرے نام سے'' پڑھتے ہی سوچا کہ تبصرہ لکھ بھیجوں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ''رفعت اشتیاق ہم سے جدا ہو گئیں''اور''امریکی تہوار'' پر نظر پڑی، پڑھتے ہی فوراً لکھنے بیٹھ گئی۔

رفعت اشتیاق صاحبہ کو میں بس اسقدر ہی جانتی ہوں کہ انہوں نے ایک دو مرتبہ میرے مضامین پر تبصرہ لکھا اور مختصر الفاظ میں بہترین لکھا۔اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے،انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور انکے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

''ابتدا تیرے نام سے'' میں صائمہ اسما صاحبہ نے جہاں قوم کو درپیش کئی ایک مسائل پر روشنی ڈالی ہے وہیں Valentine's Day کے حوالے سے معاشرے میں ہماری نوجوان نسل سے متعلق ایک بہت ہی اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔اس مشرکانہ تہوار کی منافی کرنے، دنیا بھر میں پیسہ کمانے اور نوجوان نسل میں جنسی بے راہروی کو رواج دینے،محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو بیہودگی کی بھینٹ چڑھانے کے خلاف اور اس سے اپنی نسلوں کو بچانے کے بارے میں اپنا قلم اٹھانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ۱۴ فروری قریب آ گیا اور میں سوچتی ہی رہ گئی۔

دراصل ویلنٹائن ڈے منانے کے بارے میں تاریخ سے جو کچھ بھی ملتا ہے وہ کسی بھی طرح مسلمان نوجوانوں کے لئے فائدہ مند نہیں اور نہ ہی اس کی کسی طرح بھی ہمارے معاشرے میں گنجائش ہے۔ بلکہ مغربی معاشرے میں بھی لوگ اس سے تنگ ہیں۔یہی وجہ ھے کہ فرانس نے ۱۷۷۶ میں اس تہوار کو Ban کر دیا تھا، بعد میں جرمنی، اٹلی،ہنگری اور جرمنی نے اپنی جان چھڑائی۔ پھر پیسے کے پجاریوں نے اسکا دروازہ اپنے کاروبار کو چمکانے،سرمائے کو بڑھانے اور دنیا بھر میں اس بیہودہ دن کو منانے کا اہتمام کرنے کے لئے کھول دیا۔ ۱۹۹۰ میں امریکہ میں ایک ارب کارڈ بذریعہ ڈاک بھیجے گئے جس سے محکمہء ڈاک کو ۳۰ ملین ڈالر کا منافع ہوا اور پھولوں کا بزنس بھی خوب فروغ

پانے لگا۔

اب اس تہوار سے اپنی نسل کو بچانے کے لئے ہم سب کومل کراس کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی اس کے خطرناک نتائج سے انہیں آگاہ کرنا ہوگا۔اس کام کے لئے ماؤں کو بھرپور انداز سے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پہلے ہمیں سوچنا ہے کہ اس دن جب دنیا محبت کا دن منا رہی ہے کیا ہم اپنے رب، اسکے رسول اوران تمام لوگوں سے محبت کا اظہار کرتے ہیں جن سے ہمارے رب نے محبت کا حکم دیا ہے؟ اور پھر اسلام میں تو ایسی محبت کے لئے کوئی دن مخصوص نہیں بلکہ ہر لمحہ، ہر دن اپنے رب کی اطاعت کا حکم ملتا ہے۔محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو صحیح جگہ اور صحیح انداز سے اظہار کا طریقہ اپنے بچوں کو سکھانا ہے، انہیں ویلنٹائن ڈے کی حقیقت اور برے نتائج سے خبردار کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا مددگار بننے کی ضرورت ہے۔

''امریکی تہوار'' پڑھ کر بے اختیار ایک پاکستانی فیملی یاد آ گئی جو پچھلے کچھ سالوں سے امریکہ میں مقیم تھی۔خاتونِ خانہ کا اکثر کسی نہ کسی وجہ سے پاکستان آنا جانا رہتا تھا۔اپنی ''عقلمندی'' کی کئی ایک داستانوں کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ صبح بچوں کو اسکول اور شوہر کو کام پر بھیجنے کے بعد وہ جلدی جلدی کھانا پکا کر ونڈو شاپنگ کے لئے نکل جاتی تھیں۔اس طرح ان کا دن بہترین مالز میں خوبصورت چیزوں کو دیکھتے، نئے فیشن کے بارے میں جاننے اور امریکی دوکانداروں سے گپ شپ کرتے گزر جاتا۔شاپنگ وہ صرف thanks giving اور کرسمس کے بعد کرتی تھیں کہ خوب سیل لگی ہوتی۔Holloween کے بارے میں انہوں نے دلچسپ بات بتائی جو مجھے آج بھی یاد ہے۔وہ اس دن اپنے ۵ عدد بچوں کو لے کر trick o treat منانے نکل جاتیں اور رات گئے تک ٹافیاں اور کھانے کی مختلف چیزیں جمع کرتیں۔اگلے دن بچوں اور شوہر کے چلے جانے کے بعد وہ ان چیزوں کو پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈال کر گفٹ پیک بنا لیتی تھیں اور جب وہ پاکستان آتیں تو اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دیتی تھیں اس طرح ایک طرف مفت میں بچے خوب انجوائے کرتے اور دوسری طرف رشتہ دار امریکی چاکلیٹ اور ٹافیاں کھا کر خوشی سے نہال ہوجاتے۔مگر شاید وہ بھول گئی تھیں کہ اپنے قیمتی وقت کا صحیح ترین استعمال اپنی قیمتی متاع یعنی بچوں کی اچھی

پرورش ہے نہ کہ حقیر دنیا کی حقیر چیزیں جمع کرتے ہوئے وقت گزارا جائے۔

☆☆☆

خورشید بیگم۔ گوجرہ

؎ دردِ دل ، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
یہی ہے آدمیت اور یہی انساں ہونا

ماہنامہ چمنِ بتول کی مدیرہ کو میں نے دیکھا تو نہیں لیکن عموماً تحریریں دلی جذبات کی آئینہ دار ہوا کرتی ہیں۔ نہایت دردمندی سے ہمیں حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنے کی ذمہ داری انہوں نے خود ہی سنبھال رکھی ہے۔ میں ان کی شکر گزار بھی ہوں کہ انہوں نے انوار ربانی کے عنوان کے تحت میری مرحومہ بہن رفعت اشتیاق کی منتخب کردہ تحریر کو اپنے میگزین کی زینت بنایا ہے۔

بہن عظمیٰ پروین کی تحریر ''بچے کی تربیت'' ماؤں کے لئے ایک بہترین تحفہ ہے۔ کاش وہ اس سے فائدہ اٹھالیں تو ہمارا ملک جنت کا نمونہ بن جائے۔

ثریا بتول علوی صاحبہ کا مضمون ''ہے کوئی جو میری حفاظت کا بندوبست کرے'' غیرت مسلم کو جھنجوڑ رہا ہے۔ لیکن نوجوان نسل کا کیا کریں جو مطالعہ کا شوق ہی نہیں رکھتی۔ اگر کوئی پڑھنے کی تکلیف گوارا کرے گا تو عمل کی نوبت آئے گی۔

''آدھا گلاس'' واہ کیا کہنے بہن قانتہ رابعہ کے۔ اصول دین کو کہانی کے اندر سمودینے کا فن تو کوئی ان سے سیکھے۔ ''خواہش'' انسان جلد باز واقع ہوا ہے نا۔ اپنی ہر خواہش کی تکمیل فوراً چاہتا ہے۔ جبکہ رب حکیم نے ہر کام کا وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اسی وقت کا انتظار کرنا انسان کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عزیزہ انجم کی تحریر واقعی نہاں خانۂ دل سے نکلی ہے۔ کاش ہم سب کے محبوب شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کا فرمان مسلم قوم کے حق میں سچ ثابت ہو۔

؎ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

''ایک زکام سو علاج'' کیسا منفرد انداز ہے بہن قانتہ رابعہ کا اپنے بہی خواہوں کا شکریہ ادا کرنے کا۔ میرا خیال ہے اس واقعہ کے بعد انہیں اپنے حلقۂ احباب میں اپنی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔

''دلوں میں جگہ بنایئے'' حمیرا خالد صاحبہ نے

دین اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کو انمول اصولوں سے آگاہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان اصولوں پر عمل کرنے والے مایوسی کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے۔

☆☆☆

عیشہ راضیہ۔لاہور

مارچ کے بتول میں مسز وسیم کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔ ان باا ثر لوگوں کے خیالات کو جان کر خوشی ہوئی۔آمنہ بلوچ سے امریکہ کے تہوار کا تعارف بھی ملا اوراس طرح بہت عرصہ کے بعد جمعیت کی ساتھی آمنہ بلوچ سے ملاقات بھی ہوگئی۔ خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے تو کیا بتول کے ذریعہ تحریری ملاقات چوتھائی ملاقات کہلائی جاسکتی ہے......؟

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

ماضی، حال اور مستقبل

خوشحالی یا بدحالی

تذکرہ ہر اہم بات، معاملے کا کیا جاتا ہے۔ زندگی انسان کی انفرادی ہو یا اجتماعی تذکروں سے بھری ہوتی ہے۔کوئی خاندان ہو یا قوم اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ تذکرے گزرے واقعات کے ہوں یا مستقبل کے ارادوں کے، اچھے ہوں یا برے ہر انسان اور قوم کے لئے یہ سب زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

جو اپنے ماضی کی شاندار روایات، فتوحات، کارناموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ان پر فخر کرتے ہیں۔ ان میں بھی کچھ عقل وشعور سے کام لیتے ہیں اور ان کامیابیوں کا سلسلہ توڑنا نہیں چاہتے۔ اور کچھ ان کو ''نیند کی گولی'' کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اپنے ماضی کی ناکامیوں کا تذکرہ کرنے والے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، وہ جو ان کو چھپاتے ہیں، دوسروں پر ملبہ گراتے ہیں۔ تذکرہ کرنا نہیں چاہتے، کچھ سیکھنا نہیں چاہتے، دوسرے جو ان ناکامیوں کی وجوہات کا کھوج لگاتے ، اصلاح کرتے اور نیا عزم وارادہ لے کر پھر سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ ناکامیوں کی رات کے اندھیرے سے خوف زدہ یا مایوس نہیں ہوتے کیونکہ ان کو یقین کامل ہے کہ اس رات کا انجام ایک صبح پہ ضرور ہونا ہے۔ کبھی کسی اندھیرے کو ہمیشگی نصیب نہیں ہوئی۔ زندگی کے بارے میں اپنی سوچ کو مثبت رُخ دینا ہی نصف کامیابی ہے۔ اگر کوئی یہ سوچ کہ ہر دن کے بعد اندھیری رات کا سامنا کرنا ہوگا تو وہ کیسے کامیابی کے تذکرے کرے گا۔ یہ دن رات کا آنا جانا ایک نشانی ہے عقل رکھنے والوں کے لئے۔اندھیرا ماحول میں یا ماضی میں ہو بھی تو اصلاح اور عمل کا فیصلہ شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ جن کو نور بصیرت عطا ہوجاتا ہے وہ اندھیروں میں بھی راستے دیکھ لیتے ہیں۔ کانٹے ان کے راستے میں ہوں بھی تو قدم پیچھے نہیں ہٹتے کہ کانٹے تو پلٹ جانے پہ بھی مقدر میں ہوں گے۔ کانٹوں پہ ہی چلنا ہے تو پھر روشنی ہو یا اندھیرا، رات ہو یا دن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پاؤں کے آبلے پلٹ جانے پہ بھی تکلیف دیتے رہیں گے تو پھر منزل کے قریب ہوجانے کی خوشی سے کیوں محروم ہوا جائے؟ جو منزل کو پالینے کا عزم کر لیتے ہیں رکاوٹیں ان کو حیرانی سے دیکھتی ہیں۔ انہی کے تذکرے آنے والوں کو ہمت اور حوصلے کی روشنی عطا

کرتے ہیں۔

اگر ہم باشعور، باخبر اور باضمیر وعزم والے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی بہت خاص نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ جب کسی قوم کے اندر ان نعمتوں کا فیضان ہو اگرچہ آٹے میں نمک کے برابر ہو تو پھر کوتاہیٔ عمل کا جواز نہیں رہ جاتا۔ ایک گھر میں ایک فرد۔ ایک خاندان میں دو چار لوگ اور ایک قوم میں ایک گروہ موجود ہو تو مایوسی کا سانپ کیسے ڈس سکتا ہے؟ اور ایک انسان یا قوم اپنی امیدوں کا دیا ناکامیوں کے تذکرے سے بجھانا چاہتا ہے تو معاشرے میں باشعور، باضمیر اور عزم وہمت والے زیادہ آزمائش میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ جو آزمائش میں مبتلا ہیں ان کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھنے والوں کا رویہ ایک اور کڑا امتحان ہے۔ زندگی میں آزمائش اور امتحان ہی اس کی اصل ہے۔ ماضی کے شب وروز کا تذکرہ اسی اصل سے جڑا ہوا ہے اور مستقبل کے منصوبوں کا تذکرہ انہی کی بدولت آگے بڑھتا ہے۔ انسان یا کسی قوم کو جانچنے، اس کے ایمان کا امتحان لینے کے لئے کوئی ایک دن، ایک واقعہ، خاص وقت یا خاص عمر نہیں ہوتی۔ زندگی کے راستے پہ بچھے ہوئے کانٹے ایک ہی سائز ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے۔ ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے۔ اسی لیے ہر انسان کی زبان پہ زندگی کے بارے میں مختلف تذکرے ہیں۔ ایک دوسرے کے بارے میں مختلف انداز فکر ہیں۔ ایک انسان کے بارے میں بہت سے لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ ہر کوئی اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر کسی کا زاویۂ نظر مختلف ہے۔ اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے اظہار رائے کرتا ہے۔ ایک زندگی کے کتنے مختلف پہلو ہیں۔ اور ایک انسان کے بارے میں بے شمار قسم کے تذکرے ہیں۔ کون کس کے بارے میں حق پہ ہے؟ کس کی نظر حقیقت کی نظر ہے؟ اسکا فیصلہ کون کرے کہ کس انسان یا کس قوم کا تذکرہ کوئی معنی بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ کس کی کامیابی کا پیمانہ درست ہے؟ کس کے ماضی نے شاندار روایات کو برقرار رکھا؟ ماضی کی داستان کے تذکروں کا آخری انجام کب سامنے آئے گا؟

کتنی عجیب بات ہے کہ انسان کو ملکیت کا احساس تب ہوتا ہے جب چیز ہاتھ سے نکل گئی اور پھر بس اس کا تذکرہ باقی رہ جاتا ہے۔ انسان کا ماضی اس کا اپنا ہے اپنی ملک ہے چاہے وہ ایک لمحہ ہو یا ایک عمر...... مستقبل میں اسے احساس ہوتا ہے کہ نقصان ہی اٹھایا (والعصر ☆ ان الانسان لفی خسر) دراصل انسان کا ماضی ہی اس کی حقیقی زندگی ہے۔ اور ماضی ہی اس کا

مستقبل ہے۔ جو سانس لے چکے وہ اپنے حصے میں لکھا جائے گا جو ابھی سانس لیا نہیں جو لمحہ گزارا نہیں وہ اپنے ہاتھ آیا نہیں جو چیز اپنے استعمال میں آئی نہیں، جس کے مالک آپ بنے نہیں وہ آپ کی کب ہے؟ اس کا تو بس خیال اور تذکرہ ہی ہے وہ تو گمان اور خواہش ہی ہے۔

جوانی میں معصوم بچپن کے تذکرے ہیں۔ بڑھاپے میں جوانی کی شوخیاں لمبی کالی راتوں میں جاگتی آنکھوں کا ساتھ دیتی ہیں۔ آنکھیں بند ہو جانے پہ دنیا اس جانیوالے انسان کو ایک مٹی کی ڈھیری کی شکل میں تعارف کراتی ہے۔ پھر اس خاکی انسان کی خاک ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ مٹی کی ڈھیری کا تعارف، پہچان اور تذکرہ بھی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا کہ وہ تذکرے کرنیوالے بھی انہی قدموں پہ قدم رکھے انہی راستوں میں گم ہوتے جاتے ہیں۔ ایک نئی دنیا کے باسی جہاں جا کر ہر کوئی مستقل ٹھکانہ بنالیتا ہے۔ واپسی کا امکان نہیں۔ اور وہاں جا کر اپنی ''چندروزہ زندگی'' کے شب وروز کی مصروفیتوں کا تذکرہ ہی تذکرہ ہوگا۔ اور ان میں ان لمحات کی تلاش ہوگی جن میں کوئی قابل ذکر اعمال کیے ہوں گے۔ انہی اعمال پہ مستقبل کا دارومدار ہے۔ ماضی میں جو محنت کی اسی کا پھل مستقبل میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ جوانی کی کمائی بڑھاپے میں کام آتی ہے۔ زندگی میں کیے گئے اعمال موت کے بعد کام آتے ہیں۔ ماضی کی زندگی ہی جنت یا دوزخ ہے جو انسان کا مستقبل ہے۔ اس کی تیاری کا یہی موقع ہے۔ آج کا ہر سانس ماضی بنتا جاتا ہے اور مستقبل کی ضمانت دیتا جاتا ہے۔ جو انسان اور قوم اپنے ماضی پہ نگاہ رکھتی ہے اور اپنے ''حال'' کو شاندار اور کامیاب ''ماضی'' بنانے کی مسلسل سعی وجہد کرتی ہے وہ اپنا ''مستقبل'' محفوظ کرتی جاتی ہے۔

انسان ہر روز یہ جانچ پڑتال کرتا رہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لئے اپنے کل کے لئے کیا محفوظ کررہا ہے۔ وہ مستقبل جو اٹل ہے اور جس کا فیصلہ ہر انسان کا ماضی کرے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ حال مختصر ترین ہے ''ماضی'' مختصر ہے اور مستقبل ابدی ودائمی ہے۔ گویا کہ ''حال'' بیج ہے۔ ''ماضی'' درخت ہے اور ''مستقبل'' پھل ہے جو اس بیج کا مرہون منت ہے جو کبھی بویا گیا تھا۔ اور اس کی آبیاری کی گئی تھی۔

☆☆☆